دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

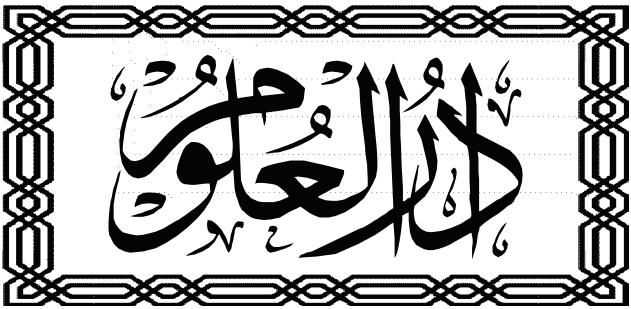

جلد: ۹۹	ربیع الاوّل ۱۴۳۶ھ مطابق جنوری ۲۰۱۵ء	شمارہ: ۱

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۲۰ روپئے، سالانہ -/۲۰۰ روپئے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۱۰۰ روپئے

بنگلہ دیش سے سالانہ -/۵۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۵۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768

Web : http://www.darululoom-deoband.com

www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine

E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Abul-Qasim Numani, Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P. Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	رسول اللہ ﷺ کے کام پر ایک نظر	ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم	۷
۳	نبیِ اکرم ﷺ بحیثیت تاجر	مفتی محمد راشد ڈسکوی	۱۲
۴	ولادتِ نبوی ۱۲/ربیع الاوّل اور وفات ۲/ربیع الاوّل — ایک تحقیق	مولانا محمد شفیع قاسمی بھٹکلی	۲۷
۵	جشنِ عید میلاد النبی ﷺ منع، آخر کیوں؟	مولانا ندیم احمد انصاری	۳۳
۶	نماز کی قضاء کا حکم	مولانا محمد نجیب قاسمی سنبھلی	۳۸
۷	یہ خیر خواہی نہیں، قتل ہے	مفتی محمد فیاض قاسمی	۴۴
۸	خواتین کی تعلیم وتربیت	مفتی محمد تبریز عالم قاسمی	۴۹
۹	ایک مردِ درویش کی رحلت	حبیب الرحمٰن اعظمی	۵۴

ختم خریداری کی اطلاع

یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

دینِ اسلام میں ''ایمان'' کے بعد ''عملِ صالح'' کا درجہ ہے؛ چنانچہ قرآن حکیم میں تنہا ایمان یا تنہا عملِ صالح کو نہیں؛ بلکہ دونوں کے مجموعہ کو نجاتِ کامل کا ذریعہ بنایا گیا ہے، اسی حقیقت کو اچھی طرح آشکارا کرنے کے لیے آیت پاک "الَّذِیْنَ آمَنُوا وَاعْمَلُوا الصٰلِحٰت" کو ایک دو مقام پر نہیں؛ بلکہ معمولی سے لفظی فرق کے ساتھ پینتالیس بار ذکر کیا گیا ہے۔

اس موقع پر یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ ''عمل صالح'' کا مفہوم بڑی وسعت و ہمہ گیری کا حامل ہے، انسانی اعمالِ خیر کی تمام جزیات اس میں داخل ہیں، تاہم اس کی جلی تقسیم عبادات، اخلاق، اور معاملات سے کی جاسکتی ہے، اعمال صالحہ اور ہر وہ بھلے کام جن کا خاص تعلق رب ذوالجلال والاکرام سے ہے، اسے فقہاء کی اصطلاح میں ''عبادت'' کہا جاتا ہے، اور جن کا تعلق بندوں کے باہمی حقوق وفرائض سے ہے؛ ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہے اس کو ''اخلاق'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جن پر قانونی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یہ ''معاملات'' کے عنوان سے معنون ہے۔

آج کی صحبت میں دینِ اسلام کے اسی دوسرے باب یعنی ''اخلاق'' پر مختصر سی گفتگو مقصود ہے، ایک انسان کا اس دنیا میں اپنے گردوپیش کی ہر چیز سے تھوڑا بہت ربط وتعلق ہوتا ہے، اسی ربط وتعلق کے حق کو خوبی اور اچھائی کے ساتھ ادا کرنے کا نام اخلاق ہے، ایک آدمی کے اپنے ماں، باپ، عزیز واقارب، دوست واحباب وغیرہ سب سے تعلقات ہیں، علاوہ ازیں ہر اس انسان سے اس کا ایک گونہ تعلق ہے جس سے وہ پڑوس، محلّہ، وطن، قومیت، جنسیت وغیرہ کا علاقہ رکھتا

ہے؛ بلکہ اس سے بھی آگے حیوانات اور جانوروں سے بھی فی الجملہ اس کے تعلقات ہیں، پھران تعلقات کی حیثیت کے مطابق اس پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، دنیا میں امن وچین، خوشی وخوشحالی انھیں اخلاقی ذمہ داریوں کی بحسن وخوبی ادائیگی پر منحصر ہے۔

اخلاق کی اسی اہمیت اور ہمہ گیر افادیت کی بنا پر دنیا کے سارے مذہبی پیشواؤں نے اپنے مذہب کی بنیاد اسی اخلاق پر رکھی ہے؛ چنانچہ دنیا میں اب تک جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے سب نے بیک زبان یہی درس دیا کہ سچ بولنا اچھا ہے، جھوٹ بولنا برا ہے، عدل وانصاف نیکی اور ظلم وزیادتی برائی ہے، الفت ومحبت کے ساتھ باہم زندگی گزارنا انسانی شرافت ہے، ایک دوسرے سے نفرت وعداوت حیوانی خصلت ہے، صدقہ وخیرات نیکی ہے اور چوری ورہزنی بدی ہے وغیرہ؛ لیکن دینِ اسلام تو اس باب میں تکمیلی مقام ومرتبہ کا حامل ہے، پیغمبرِ اسلام ﷺ کا ارشاد ہے "بعثتُ لِأُتَمِّمَ مَكارِمَ الأَخْلاقِ": میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کردوں؛ چنانچہ بعثت کے وقت ہی سے آپ ﷺ نے اس فرض کی انجام دہی شروع کردی تھی، مکی دور کے آغاز میں ابوذر غفاریؓ نے اپنے بھائی کو نئے پیغمبر کے حالات وتعلیمات کی تحقیق کے لیے بھیجا تو انھوں نے واپس جاکر اس بارے میں اپنے بھائی کو جو اطلاع دی وہ یہ تھی "رَأَيْتُهُ يَأْمُرُ بِمَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ" میں نے انھیں دیکھا کہ وہ اچھے اخلاق کی لوگوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ اسلام میں اخلاقِ حسنہ کی جس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ خلق عظیم کے حامل پیغمبر اعظم ﷺ نماز میں جو دعا مانگتے تھے، اس کا ایک جز، یہ بھی ہوتا تھا "وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ" الحدیث، بار الٰہا! مجھے بہترین اخلاق کی رہنمائی فرما!

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے، جس سے باہم انسانوں میں فرقِ مراتب نمایاں ہوتا ہے۔ نبیِ رحمت ﷺ فرماتے ہیں "خِيَارُكُمْ اَحْسَنُكُمْ أَخْلَاقاً": تمہارا سب سے بہتر اخلاق والا تم میں سب سے بہتر اور بھلا ہے۔ اخلاق قدرت کا سب سے اچھا عطیہ ہے، فرمانِ نبوی ﷺ ہے: "خَيْرُ مَا أُعْطِيَ النَّاسُ خُلُقٌ حَسَنٌ": لوگوں کو جو چیزیں عطا کی گئی ہیں، ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔

اسلام جہاں اپنے ماننے والوں کو اپنے والدین، اولاد دیگر رشتہ داروں اور ہم مذہب والوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور حسنِ اخلاق کا حکم دیتا ہے، وہیں بلاتفریقِ دین ومذہب محض انسانیت

کے ناطے پوری انسانی برادری کے ساتھ بھی حسنِ اخلاق اور رواداری کی تاکید کرتا ہے، بالخصوص پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی اس قدر تاکید کی گئی ہے کہ آں حضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ جبرئیلؑ نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اس قدر تاکید کی کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ کہیں پڑوسی کو وراثت میں شریک نہ بنادیں، ایک موقع پر فرمایا کہ جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ پڑوسی کی عزت کرے، ایک دفعہ انتہائی دلنشیں اور مؤثر طریقہ پر پڑوسی کے حق کو بیان کرکے فرمایا: بخدا وہ مومن نہیں ہوگا، بخدا وہ مومن نہیں ہوگا، بخدا وہ مومن نہیں ہوگا! صحابۂ کرامؓ نے پوچھا کون یارسول اللہ ﷺ؟ فرمایا: وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہ رہے۔ آں حضرت ﷺ کی ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور مددگار بن گیا تھا، ہمسایوں میں دوست و دشمن، مسلم اور غیر مسلم کی تمیز اٹھ گئی تھی؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی آپ کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا، غلام کو ہدایت کی کہ سب سے پہلے گوشت پڑوسی کو پہنچادے، ایک شخص نے کہا: وہ تو یہودی ہے، فرمایا: یہودی ہے تو کیا ہوا، یعنی یہ تو حقِ ہمسائیگی ہے جس میں اپنے پرائے کی تفریق نہیں۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو تلقین کرتا ہے کہ ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ حقوق و فرائض ہیں، جن کا ادا کرنا مسلمان کا مذہبی و اخلاقی فرض ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں ہے: ''قُولُوا لِلنَّاسِ حُسنًا'' لوگوں سے اچھی بات کہو، آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''لَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مَنْ لَا یَرْحَمِ النَّاسَ'': اللہ اس پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا ہے۔ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا: ''اِرْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ'': تم لوگ زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ ایک حدیث میں آپ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو پانچ باتوں کی تعلیم دی، اس میں چوتھی بات یہ تھی ''اَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ مُسْلِماً'': لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، تو قابل تعریف مسلمان بن جاؤگے۔ یہ اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے تمام حقوق کی بنیاد ہے۔

الغرض! دینِ اسلام کی یہی وہ انسانیت نواز تعلیم ہے، جس نے اس کے باوفا نام لیواؤں میں ایسی محبوبیت پیدا کردی تھی کہ دنیا کے جس حصہ میں بھی پہنچ گئے وہاں کے وہ آنکھوں کا نور اور

دلوں کا سرور بن گئے؛ چنانچہ چودھویں صدی ہجری کا مشہور سیاح وجغرافیہ نویس ابواسحاق اصطخری جو ہندوستان بھی آیا تھا، اپنی مفید کتاب ''مسالک الممالک'' میں لکھتا ہے:

''جنوبی ہند میں عرب رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد ہی آنے لگے تھے اور انھوں نے جنوبی ہند کے ساحلوں خصوصاً ملیبار میں اپنے اخلاق کی بلندی اور میل جول کی رواداری سے ان علاقوں کے لوگوں پر خوشگوار اثرات پیدا کیے، ہندو راجاؤں کی نظروں میں بھی کافی عزت اور توقیر حاصل کرلی تھی، یہی وجہ تھی کہ جب وہ اپنی مذہبی تبلیغ کرتے تو ان کی سرگرمیوں میں کوئی رکاوٹ نہیں کی جاتی تھی۔''

افسوس کہ اسلام کی اس بیش بہا دولت اور بے پناہ قوت سے آج ہمارا دامن خالی ہے، جس کے نتائجِ بد ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

❁ ❁ ❁

رسول اللہ ﷺ کے کام پر ایک نظر

از: ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم

دُنیا میں لاتعداد مذاہب ہیں، ان میں کئی توحید پرستی پر مبنی ہیں۔ متعدد مذاہب کے پیروکاروں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ ممکن ہے اسلام اپنے پیروکاروں کی تعداد کے اعتبار سے سب سے بڑا مذہب نہ ہو؛ مگر یہ ایک زندہ اور فروغ پذیر مذہب ہے۔ دُنیا کے تمام مذاہب اور لادینی عناصر اس کے خلاف مصروفِ عمل ہیں؛ کیونکہ یہ ایک آفاقی دین ہے اور کسی خطّے یا نسل تک محدود نہیں۔ اسلام میں کسی بھی قومیت میں سرایت کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے؛ تاہم ہمارا موضوع اسلام نہیں؛ بلکہ اس عظیم دین کا داعی ہے۔

ادیان کی تاریخ عالم میں یہ کلیہ ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کے بانی کی زندگی اور جدوجہد کے بارے میں بہت کم جانتا ہے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کو اپنی دنیاوی زندگی کے دوران زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی، ان کے لائے ہوئے دین کو ان کی موت کے بعد ہی وسعت ملی اور ترقی حاصل ہوئی۔ ادیان کے ان بانی حضرات کی تعلیمات اپنی اصل شکل میں نہیں؛ بلکہ جستہ جستہ ہم تک پہنچی ہیں۔ ان مذاہب کے پیروکاروں نے تاریخ کے عمل کے دوران اپنے ادیان کو وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانے کے زعم میں ان کے اصولوں اور عملی پہلوؤں میں کئی تبدیلیاں کردیں۔

محمد ﷺ اس قاعدہ کے تمام اصول وضوابط میں ایک استثنا ہیں۔ ان کی زندگی کے بارے میں آنکھوں دیکھے احوال پر جلدوں کی جلدیں موجود ہیں جن میں ان کی پوری زندگی کے ایک ایک لمحے کی تفصیل درج ہے۔ ان کے ذاتی اعمال، ان کے دور اور معاشرہ کی ذرا ذرا سی تفصیل بھی بیان کردی گئی ہے۔ رسولِ اسلام ﷺ اپنی زندگی میں ہی عظیم ترین کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ جب حجۃ الوداع کے موقع پر انھوں نے ایک لاکھ چالیس ہزار سے زائد مسلمانوں کے

عظیم اجتماع سے خطاب کیا جو مختلف علاقوں سے حج کا فریضہ ادا کرنے مکہ معظّمہ آئے تھے، ان سے کئی گنا مسلمان اپنے گھروں میں موجود تھے؛ کیونکہ مسلمانوں پر ہر سال حج کرنا فرض نہیں۔ نہ ہی ان پر یہ فرض تھا کہ وہ کسی خاص سال کے موقع پر ضرور ہی حج کعبہ کو جائیں۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد بھی اسلام کو زبردست کامیابی نصیب ہوئی؛ مگر اسلام کے داعی کی زندگی میں ان کی تعلیمات کو جو کامیابی حاصل ہوئی، تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جہاں تک رسولِ اسلام ﷺ کی تعلیمات کا تعلق ہے قرآنِ حکیم لفظ بلفظ ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی زبان وہی ہے جس میں وہ نازل ہوا تھا اور یہ جس انداز میں ہم تک آیا ہے وہ قابلِ اعتماد ہے۔ چودہ صدیاں گزر گئیں، اس دوران رسول اللہ ﷺ کی جائے پیدائش یا دنیا میں کسی اور جگہ قرآن میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی۔ ہم جانتے ہیں کہ محمد ﷺ کس طرح نماز ادا کرتے تھے، روزہ کیسے رکھتے تھے، اور اُنھوں نے حج کس انداز میں کیا تھا؛ چنانچہ تمام مسلمان آج بھی ان روحانی فرائض کو عین اسی طرح انجام دیتے ہیں جس طرح رسولِ اسلام ﷺ نے انجام دیے تھے۔ دوسرے متعدد مذاہب کے پیروکاروں کی طرح ایسے مسلمانوں کی بھی کمی نہیں جو اپنے دین پر عمل نہیں کرتے؛ بلکہ بعض تو محض نام کے مسلمان ہیں۔ اس کے باوجود کسی مسلمان نے خواہ وہ محض نام کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو دینِ اسلام کو وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانے کے لیے اس میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خود ہمارے دور میں تمام مذاہب میں اصلاح کی تحریکیں سرگرمِ عمل ہیں؛ مگر یہ عجیب بات ہے کہ دوسرے مذاہب کو تو جدید دَور کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کے لیے ان میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے؛ مگر مسلم مصلحین بیک زبان محمد ﷺ کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کی تلقین کررہے ہیں۔ کسی مذہب کے بانی کو اس سے بڑا خراجِ عقیدت بھلا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کی تعلیمات آج بھی زندہ و متحرک ہیں اور ان میں ذرہ برابر تبدیلی کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جارہی۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کی سوانح پر ہزاروں کُتب موجود ہیں۔ ان کے مصنفوں میں اسلام کے دوست اور دشمن سبھی شامل ہیں۔ تمام مصنف خواہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کو پسند کریں یا محض اس بات پر ناپسند کریں کہ ان مصنفوں کا تعلق اسلام کے مخالف مذاہب

سے ہے، اِس بات پر متفق ہیں کہ محمد ﷺ ایک عظیم انسان تھے۔ جن مصنفوں نے جان بوجھ کر پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی اور تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے---اور ایسے مصنفوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے--- دراصل وہ بھی انھیں بالواسطہ طور پر خراجِ عقیدت پیش کررہے ہیں۔ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کو مسخ کرکے پیش کرتے ہیں؛ کیونکہ وہ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ اگر انھوں نے اسلام کی صحیح تصویر پیش کردی تو ان کے ہم مذہب ''گمراہ'' ہوجائیں گے جنھیں وہ قبولِ اسلام سے روکنے کے لیے پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق بے سروپا کہانیاں گھڑکر سناتے رہتے ہیں، اس طرح کی ذہنی بددیانتی آج بھی جاری ہے۔ یہ بات تحیرخیز ہے کہ جدید مغرب کے زبردست مادی اور دُوسرے وسائل کے باوجود حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات کے خلاف پروپیگنڈہ کوئی نتائج پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے، جن کی توقع اتنی بڑی تعداد میں کتابوں کی اشاعت، ریڈیو، ٹی وی نشریات اور فلموں کی نمائش کے بعد کی جاسکتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ جتنے وسائل عیسائی مشنریوں اور کمیونسٹوں کو حاصل ہیں، اگر اسلام اتنے ہی وسائل سے بہرہ ور ہوتا تو دُنیا کا رُخ کیا ہوتا؛ لیکن اس کے باوجود یہ ایک عیاں حقیقت ہے کہ مسیحی اور کمیونسٹ مغرب دونوں میں اسلام نہایت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد تیس سال کے دوران انگلستان میں کوئی ایک سو سے زاید مساجد تعمیر ہوئی ہیں۔ جرمنی اور فرانس بھی اس میدان میں انگلستان سے پیچھے نہیں۔ امریکی سفید فاموں میں بھی قبولِ اسلام کے واقعات کی کمی نہیں۔ چنانچہ اسلام کو گلے لگانے والوں میں سفراء، پروفیسر اور دیگر معزز پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ ہر سال سیکڑوں سیّاح استنبول میں مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں، جہاں اناطولیہ کی نسبت مذہبی جوش وخروش زیادہ نہیں ہے۔

محمد ﷺ کی تعلیمات کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا رشتہ زندگی کے ہر شعبہ سے قایم ہے۔ وہ محض مافوق الطبعیات عقاید تک محدود نہیں۔ وہ انسان کی روحانی زندگی کے ساتھ ساتھ دُنیوی زندگی کے لیے بھی اصول وقواعد بیان کرتے ہیں؛ حتی کہ سیاسیات بھی ان کی تعلیمات کے دائرہ سے باہر نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام انسان کی پوری زندگی کی تعمیر میں مدد دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرح محض روحانی پہلو پر نظر نہیں رکھتا اور نہ ہی سیاست کو محض

حکمرانوں کے رحم وکرم پر چھوڑتا ہے۔

ہم بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے پیروکاروں کی زندگی اور ذاتی رویّہ پر دینِ اسلام کے اثرات دوسرے مذاہب کی نسبت نہایت گہرے ہیں۔ یہ مذاہب آفاقیت کے دعویدار تو ہیں، مگر وہ اپنے پیروکاروں میں نسل اور رنگ کا تعصب تک ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ میں نے ۱۹۳۲ء میں انگلستان کی ایک مسجد میں ایک انگریز مؤذّن دیکھا۔ اس نے بڑے فخر سے اپنا نام بلال رکھا ہوا تھا جو پیغمبرِ اسلام ﷺ کے حبشی نژاد مؤذّن کا نام بھی تھا۔ یہ کتنی نرالی بات ہے کہ فِن لینڈ کے ایک شخص عقیل نے جو سویڈن میں آباد ہے محض مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرلیا؛ حالانکہ قبل ازیں کسی مسلمان سے اس کا تعارف تک نہ تھا۔ پھر فرانسیسی نژاد گینن کو بھی اس نے مشرف بہ اسلام کیا۔ گینن کے پیروکار فرانس، سوئزرلینڈ اور دوسرے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور سیکڑوں افراد کو حلقۂ اسلام میں داخل کرچکے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مغرب والوں کو صرف فخرالدین رازی نے ہی نہیں، محی الدین ابن عربی نے بھی زبردست متاثر کیا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کافر ہلاکو خاں نے عالمِ اسلام کو فتح کرلیا اور عباسیوں کے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی؛ مگر چند درویشوں نے اُس کے پوتے غزن خاں کو مشرف بہ اسلام کیا اور عالمِ اسلام کو تباہ وبرباد کرنے والوں کو اسلام کا عظیم علمبردار بنا کر رکھ دیا۔

اگر دیگر مذاہب کے بانیوں نے ایک دوسرے پر بعض انسانی خوبیوں میں سبقت حاصل کی ہے تو پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اتنے شعبوں میں فضیلت حاصل کی ہے کہ طالب علم حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ وہ ایک عظیم اور جامع صفات قانون ساز تھے جنھوں نے تمام قانونی سوالات کے جواب میں قواعد مرتب کیے ہیں۔ وہ بہت بڑے منتظم تھے جنھوں نے مُشتِ خاک سے ایک عظیم مملکت قایم کی۔ وہ خود اس کے منتظم اعلیٰ تھے۔ انھوں نے فوجوں کی کمان کی اور بسا اوقات اپنی رضاکار فوج سے تین سے پندرہ گنا بڑی فوج تک کو شکست فاش دی۔ اُن کی اخلاقی تعلیمات پُرمغز ہیں اور ان تعلیمات کو محض مثالی؛ مگر ناقابلِ عمل بنانے کے لیے کسی مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ اگر کوئی تمھارے دائیں گال پر چپت رسید کرے تو بایاں گال بھی اس کے آگے کردو؛ بلکہ وہ کہتے ہیں ''اگر تم ادلے کا بدلہ لو تو یہ بالکل درست اور جائز ہے؛ لیکن اگر تمام معاف کردو تو یہ اللہ کے نزدیک مستحسن ہے۔'' یوں ان کی تعلیمات عام

آدمی کے لیے بھی اسی طرح قابلِ عمل ہیں جس طرح کسی ولی، رشی یا مُنی کے لیے۔ یہ تعلیمات عام آدمی کو ارتکابِ گناہ سے روکتی ہیں اور اسے معقول حدود کے اندر رکھتی ہیں۔ ان کی مذہبی تعلیمات کے مطابق ''بندہ خدا کا اور خدا بندے کا ہے۔'' یوں اُنھوں نے خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست رابطہ قائم کرادیا ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی یہ کسی کی اجارہ داری ہے۔ محمد ﷺ کی تعلیمات میں خدا کی وحدانیت، اس کی لاتعداد صفات اپنی مخلوق کے لیے اس کی محبت اور رحم کا کوئی اور مذہب ثانی پیش نہیں کرسکتا۔ اسلام میں خدا ''رب العالمین'' ہے۔ وہ ودود (محبت کرنے والا) ہے، رحیم (رحم کرنے والا) اور غفور (معاف کرنے والا) ہے۔ وہ قیامت کو سزا دینے میں حق بجانب ہے؛ مگر اس کی رحمت اس کے غضب سے سوا ہے (سَبَقَتْ رَحْمَتِي عَلٰى غَضَبِي - حدیثِ رسولؐ)

محمد ﷺ نے نسلِ انسانی کو تمام اخلاق سکھایا اور جب وہ مطمئن ہوگئے کہ انھوں نے اپنا مشکل ترین مشن بحسن وخوبی تمام کردیا ہے تو اُنھوں نے اس کی بلند رفاقت کو ترجیح دی (مع الرفیق الاعلیٰ)

اللّٰهم صل على سيّدنا محمد وعلى ال سيدنا محمد واصحاب سيدنا محمد وبارك وسلِّم وصل عليه.

❁ ❁ ❁

نبی اکرم ﷺ بحیثیت تاجر

از: مفتی محمد راشد ڈسکوی
رفیق شعبۂ تصنیف وتالیف واستاذ جامعہ فاروقیہ کراچی

کائنات میں بسنے والے ہر ہر فرد کی کامل رہبری کے لیے اللہ رب العزت کی طرف سے رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث کیا گیا، سب سے آخر میں بھیج کر، قیامت تک کے لیے آنجناب کے سر پر تمام جہانوں کی سرداری ونبوت کا تاج رکھ کر اعلان کر دیا گیا کہ اے دنیا بھر میں بسنے والے انسانو! اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر اور پُرسکون بنانا چاہتے ہو تو تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی مبارک ہستی میں بہترین نمونہ موجود ہے (الاحزاب:۲۱) ان سے رہنمائی حاصل کرو اور دنیا وآخرت کی ابدی خوشیوں اور نعمتوں کو اپنا مقدر بناؤ، گویا کہ اس اعلان میں دنیا میں بسنے والے ہر ہر انسان کو دعوتِ عام دی گئی ہے کہ جہاں ہو، جس شعبے میں ہو، جس قسم کی رہنمائی چاہتے ہو، جس وقت چاہتے ہو، تمہیں مایوسی نہ ہوگی، تمہیں تمہاری مطلوبہ چیز سے متعلق مکمل رہنمائی ملے گی، شرط یہ ہے کہ تم میں طلبِ صادق ہو، چنانچہ! تاجر ہو یا کاشتکار، شریک ہو یا مضارب، مزدور ہو یا کوئی بھی محنت کش، ماں ہو یا باپ، بیٹا ہو یا بیٹی، میاں ہو یا بیوی، مسافر ہو یا مقیم، صحت مند ہو یا مریض، شہری ہو یا دیہاتی، پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ؛ اگر وہ چاہے کہ میرے لیے میرے شعبے میں رہنمائی ملے، تو اس کے لیے جناب رسول اللہ ﷺ کی مبارک ہستی میں نمونہ موجود ہے، مذکورہ آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے سامنے جنابِ رسول اللہ ﷺ کو لا کھڑا کیا ہے کہ میرے اس محبوب کو دیکھو، تمہیں ہر چیز ملے گی، اپنے سے متعلق روشنی حاصل کرو اور اس پر عمل پیرا ہو کر اللہ کے محبوب بن جاؤ، تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تشریح میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"هذه الآية الكريمة أصلٌ كبيرٌ في التأسّي برسول الله ﷺ في أقواله، وأفعاله، وأحواله" (تفسير ابن كثير، سورة الأحزاب: ٣١، ٦/ ٣٩١)

کہ یہ آیت کریمہ نبی اکرم ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کی اتباع کرنے میں بہت بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علماء امت نے امتِ محمدیہ کی آسانی اور سہولت کی خاطر جنابِ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ہر ہر پہلو کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے خوب سے خوب محنت کی، بے شمار کتب تصنیف کیں؛ تاکہ کوئی بھی شخص اپنے شعبے سے متعلق جنابِ رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی کو دیکھنا چاہے تو اسے بغیر دقّت کے آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی تعلیمات معلوم ہوسکیں، جنابِ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنا نبی اکرم ﷺ کا ہم پر حق بھی ہے، اور محبت کا تقاضا بھی، اور یہ بات بھی پوری طرح واضح رہنی چاہیے کہ یہ حق اور تقاضا صرف ماہِ ربیع الاول کے پہلے بارہ دن یا پورے مہینے کے لیے ہی نہیں؛ بلکہ پوری زندگی اور زندگی کے ہر ہر لمحے کے لیے ہے۔

ان سطور سے مقصود نبی اکرم ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ کو سمیٹنا نہیں ہے؛ بلکہ صرف آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی سیرتِ طیبہ سے تجارت کے پہلو کو واضح کرنا مقصود ہے، آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے تجارت کا پیشہ اپنایا اور رزقِ حلال سے اپنی زندگی کا رشتہ اُستوار رکھا، نبوت کے اس پہلو کو سمجھنے کے لیے اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے دو حصے ہیں، ایک: نبوت ملنے سے قبل کا اور دوسرا: نبوت ملنے کے بعد کا، اول الذکر کا دورانیہ چالیس سال ہے اور ثانی الذکر کا دورانیہ تیئیس سال، اس دوسرے حصے کے پھر دو حصے ہیں، ایک: مکی دور اور دوسرا: مدنی دور۔

نبوت سے قبل کی معاشی کیفیت

نبی اکرم ﷺ کا نبوت سے پہلے والا دور مالی اور معاشی اعتبار سے کوئی خوش الحال دور نہیں تھا؛ لیکن اس کے برعکس یہ کہنا بھی درست نہیں کہ آپ ﷺ بہت ہی زیادہ مفلوک الحال زندگی بسر کر رہے تھے؛ البتہ یہ ضرور تھا کہ آنجناب بچپن سے ہی محنت ومشقت کر کے اپنی مدد آپ ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کا ذہن رکھتے تھے۔

والد کی طرف سے ملنے والی میراث

جب آپ ﷺ کی پیدائش ہوئی تو آپ کے سر سے والد کا سایہ اٹھ چکا تھا، ان کی طرف سے بطورِ میراث بھی کوئی جائیداد آپ کی طرف منتقل نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ کتبِ سیرت میں اس کی

تفصیل میں صرف یہ منقول ہے کہ آپ ﷺ کو میراث میں صرف پانچ اونٹ، چند بکریاں اور ایک باندی ملی، جس کا نام ''ام ایمن'' تھا، (اس باندی کو بھی جنابِ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کے وقت یعنی: پچیس سال کی عمر میں آزاد کردیا تھا) اس کے علاوہ مزید کوئی چیز میراث میں نہ ملی تھی، ملاحظہ ہو:

''ترك عبدُ اللّٰه بنُ عبدِ المطلب أمَ أيمنَ وخمسةَ أحمالِ أوارِكَ، يعني: تأكل الأراك، وقطعة غنم، فورث ذلك رسول اللّٰه ﷺ''. (الطبقات الكبرىٰ لابن سعد، ذكر وفات عبد الله بن عبد المطلب: ۱/ ۸۰)

میراث میں ملنے والی اشیاء اس قابل نہ تھیں کہ آپ کی کفالت کے لیے کافی ہو جاتی، یہی وجہ تھی کہ دیہاتی علاقوں سے آکر جو عورتیں بچوں کو پرورش اور تربیت کے لیے لے جایا کرتی تھیں، آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف ان میں سے کسی کا بھی رجحان آپ کی طرف نہیں ہوا کہ یہ تو یتیم اور غریب بچہ ہے، اس کی پرورش کرنے پر ہمیں اس کی والدہ کی طرف سے کچھ خاص معاوضہ نہ مل سکے گا، اور حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے جو آپ علیہ الصلاۃ والسلام کا انتخاب کیا تھا، وہ بھی ابتداءً نہیں کیا تھا؛ بلکہ جب ان کے لیے کوئی اور بچہ نہ بچا، تو پھر ان کو خیال آیا چلو خالی ہاتھ واپس جانے کے بجائے اس یتیم بچے کو ہی لے جانا چاہیے۔

دادا اور چچا کی کفالت میں

ان ابتدائی دو سالوں میں آپ ﷺ کی کفالت آپ کے دادا عبدالمطلب کرتے رہے، دو سال کے بعد آپ کے دادا بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئے، دادا کے انتقال کے بعد آپ کے چچا ابوطالب نے آپ کی کفالت اپنے ذمہ لے لی، ابوطالب آپ کے حقیقی چچا تھے، جو بہت ہی ذوق وشوق اور محبت سے آپ کی پرورش کرتے رہے اور آپ کی ضروریات پوری کرنے کی اپنی مقدور بھر سعی کرتے رہے؛ چنانچہ! آپ کے چچا جب تجارت کی غرض سے دوسرے شہروں میں جاتے تو اپنے بھتیجے کو بھی ہمراہ لے جاتے۔

بکریاں چرانا

مکہ مکرمہ میں حصولِ معاش کے لیے عام طور پر گلہ بانی اور تجارت عام تھی؛ چنانچہ آپ ﷺ

نے اپنی حیاتِ مبارکہ کی ابتداء میں ہی اپنے معاش کے بارے میں از خود فکر کی، ابتداءً اہلِ مکہ کی بکریاں اجرت پر چراتے تھے، بعد میں تجارت کا پیشہ بھی اختیار کیا، اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں تھی؛ بلکہ یہ تو آپ ﷺ کی عظمت اور تواضع کی کھلی دلیل ہے؛ اس لیے کہ بکریاں چرانے والے شخص میں جفاکشی، تحمل و بردباری اور نرم دلی پیدا ہوجاتی ہے؛ اس لیے کہ بکریاں چرانا معمولی کام نہیں ہے؛ بلکہ بہت ہی زیادہ ہوشیاری اور بیدار مغزی والا کام ہے؛ اس لیے کہ بکریاں بہت کمزور مخلوق ہوتی ہیں، تیز اور پھرتیلی ہوتی ہیں، انھیں قابو میں رکھنے کے لیے بھی خوب پھرتی کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اس جانور کے قابو سے باہر ہونے کی صورت میں ان پر غصہ اتارنا بھی ممکن نہیں، یعنی: غصہ کی وجہ سے مار بھی نہیں سکتے؛ کیونکہ وہ کمزور ہوتی ہیں، اس بناپر بکریاں چرانے والوں میں کافی تحمل پیدا ہوجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے بکریاں چرائی ہیں، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"ما بعث الله نبياً إلّا رعىٰ الغنمَ، فقال أصحابُه: وأنتَ؟ فقال: نعم! كنتُ أرعاها علىٰ قَراريط لأهلِ مكةَ. (صحيح البخاري، كتاب الإجارات، باب رعى الغنم على قراريط، رقم الحديث: ٢٢٦٢)

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ نے جو بھی نبی بھیجا، اس نے بکریاں ضرور چرائیں، صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ نے بھی؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: ہاں! میں بھی مکہ والوں کی بکریاں قراریط پر چراتا تھا۔

''قراریط'' سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے، بعض کا قول یہ ہے کہ یہ درہم یا دینار کے ایک ٹکڑے کا نام ہے، اس صورت میں مطلب یہ بنے گا کہ کچھ قراریط کے عوض بکریاں چرائیں، اور بعض کا قول ہے کہ یہ مکہ مکرمہ کے ایک محلّہ ''جیاد'' کا نام ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مقام قراریط میں بکریاں چرائیں، علامہ ابن ملقن رحمہ اللہ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے کہ یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ (التوضيح لشرح الجامع الصحيح ، كتاب الإجارات، باب رعى الغنم، رقم الحديث: ٢٢٦٢، ١٥/ ٣٥، ٣٦)

اسی طرح ایک بار نبی اکرم ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جنگل تشریف لے گئے، صحابہؓ بیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو خوب سیاہ ہوں وہ کھاؤ، وہ زیادہ مزے کی ہوتی ہیں، یہ میرا اس زمانے کا تجربہ ہے، جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا

تھا۔(صحيح ابن حبان، كتاب الإجارة، ذكر العلة التي من أجلها قال ﷺ للكباث الأسود: إنه أطيب من غيره، رقم الحديث: ٥١٤٤، ١١/٥٤٤)

ملکِ شام کی طرف پہلا سفر

نبی اکرم ﷺ نے شام کی طرف دو سفر کیے، پہلا: اپنے چچا کے ہمراہ؛ لیکن اس سفر میں آپ ﷺ بطورِ تاجر شریک نہ تھے؛ بلکہ محض تجارتی تجربات حاصل کرنے کے لیے آپ کے چچا نے آپ کو ساتھ لیا تھا، اسی سفر میں بحیرا راہب والا مشہور قصہ پیش آیا، جس کے کہنے پر آپ کے چچا نے آپ ﷺ کو حفاظت کی خاطر مکہ واپس بھیج دیا۔(الطبقات الكبرىٰ، ذكر أبي طالب وضمه رسول الله ﷺ إليه، وخروجه معه إلى الشام في المرة الأولى: ١/٩٩)

ملکِ شام کی طرف دوسرا سفر

اور دوسرا سفر: آپ ﷺ نے بطور تاجر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سامان لے کر اجرت پر کیا۔قصہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ جب آپ ﷺ پچیس برس کے ہوگئے تو آپ کے چچا ابو طالب نے کہا کہ اے بھتیجے! میں ایسا شخص ہوں کہ میرے پاس مال نہیں ہے، زمانہ کی سختیاں ہم پر بڑھتی جا رہی ہیں، تمہاری قوم کا شام کی طرف سفر کرنے کا وقت قریب ہے، خدیجہ بنت خویلد اپنا تجارتی سامان دوسروں کو دے کر بھیجا کرتی ہے، تم بھی اجرت پر اس کا سامان لے جاؤ، اس سے تمہیں معقول معاوضہ مل جائے گا، یہ گفتگو حضرت خدیجہ کو معلوم ہوئی تو اس نے خود آپ ﷺ کو پیغام بھیج کر بلوایا کہ جتنا معاوضہ اوروں کو دیتی ہوں، آپ کو اس سے دوگنا دوں گی، اس پر ابو طالب نے آپ ﷺ کو کہا کہ یہ وہ رزق ہے جو اللہ نے تمہاری جانب کھینچ کر بھیجا ہے، اس کے بعد آپ ﷺ قافلے کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے، آپ کے ہمراہ حضرت خدیجہ کا غلام ''میسرہ'' بھی تھا، جب قافلہ شام کے شہر بصریٰ میں پہنچا تو وہاں نسطورا راہب نے آپ ﷺ میں نبوت کی علامات پہچان کر آپ کے نبی آخر الزمان ہونے کی پیشین گوئی کی۔

دوسرا اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ جب آپ ﷺ نے تجارتی سامان فروخت کر لیا تو ایک شخص سے کچھ بات چیت بڑھ گئی، اس نے کہا کہ لات وعزیٰ کی قسم اٹھاؤ، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مَا حَلَفْتُ بِهِمَا قَطُّ، وَإِنِّي لَأَمُرُّ فَأَعْرِضُ عَنْهُمَا''. میں نے کبھی ان دونوں کی قسم نہیں

کھائی، میں تو ان کے پاس سے گذرتے ہوئے ان سے منہ موڑ لیتا ہوں۔ اس شخص نے یہ بات سن کر کہا، حق بات تو وہی ہے، جو تم نے کہی، پھر اس شخص نے میسرہ سے مخاطب ہو کر کہا: ''هٰذا وَاللّٰهِ نَبِيٌّ، تَجِدُهٗ أَحْبَارُنَا مَنْعُوْتاً فِيْ كُتُبِهِمْ''۔ خدا کی قسم یہ تو وہی نبی ہے، جس کی صفات ہمارے علماء کتابوں میں لکھی ہوئی پاتے ہیں۔

تیسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ میسرہ نے دیکھا کہ جب تیز گرمی ہوتی تو دو فرشتے نبی اکرم ﷺ پر سایہ کر رہے ہوتے تھے، یہ سب کچھ دیکھ کر میسرہ تو آپ ﷺ سے بہت ہی زیادہ متاثر تھا، واپسی میں ظہر کے وقت جب واپس پہنچے تو حضرت خدیجہ نے اپنے بالاخانے میں بیٹھے بیٹھے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ اونٹ پر بیٹھے اس طرح تشریف لا رہے تھے کہ دو فرشتوں نے آپ پر سایہ کیا ہوا تھا، حضرت خدیجہ اور ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورتوں نے یہ منظر دیکھ کر بہت تعجب کیا، اور پھر جب میسرہ کی زبانی سفر کے عجائب، نفعِ کثیر اور نسطورا راہب اور اس جھگڑا کرنے والے شخص کی باتیں سنیں تو بہت زیادہ متاثر ہوئیں، حضرت خدیجہ بہت زیادہ دور اندیش، مستقل مزاج، شریف، باعزت اور بہت مال دار عورت تھیں، انھوں نے آپ ﷺ کو نکاح کا پیغام بھیج کر نکاح کر لیا، اس وقت نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک پچیس سال اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی۔ (ملخّص من الطبقات الكبرىٰ، ذكر خروج رسول الله ﷺ إلى الشام في المرة الثانية، ذكر تزويج رسول الله ﷺ خديجة بنت خويلد: ۱/۱۰۷-۱۰۹)

یمن کی طرف دو سفر

جو تجارتی اسفار نبی اکرم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وجہ سے کیے، ان میں دو سفر یمن کی طرف بھی تھے، امام حاکم رحمہ اللہ نے المستدرک میں نقل کیا ہے:

"استأجرتُ خديجةُ رضوانُ الله عليها رسولَ الله ﷺ سفرتين إلىٰ جُرَشَ، كل سفرةٍ بقَلوصٍ". (المستدرك على الصحيحين، كتاب معرفة الصحابة، ومنهم خديجة بنت خويلد، رقم الحديث: ۴۸۳۴، ۳/۲۰۰)

کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم ﷺ کو جرش (یمن کے ایک مقام) کی طرف دو بار تجارت کے لیے اونٹنیوں کے عوض بھیجا۔

بحرین کی طرف سفر

نبوت سے قبل آپ ﷺ کے بحرین کی طرف سفر کرنے کا بھی اشارہ ملتا ہے، وہ اس طرح کہ جس طرح آپ ﷺ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود حاضر خدمت ہوتے رہے، انھیں وفود میں بحرین سے وفدِ عبدالقیس بھی آیا، تو آپ ﷺ نے اہلِ وفد سے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کے احوال دریافت فرمائے، تو لوگوں نے تعجب سے پوچھا، کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ تو ہمارے ملک کے احوال ہم سے بھی زیادہ جانتے ہیں، تو آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: کہ ہاں میں تمہارے ملک میں خوب گھوما ہوں۔ (ملاحظہ فرمائیں: مسند أحمد بن حنبل، بقية حديث وفد عبد القيس، رقم الحديث: ۱۵۵۵۹، ۲۴/ ۳۲۷)

تجارتی اسفار میں آپ ﷺ کے خصائلِ حمیدہ

نبی اکرم ﷺ اپنی عمر مبارک کے پچیسویں سال تک تجارتی اسفار میں اپنے اخلاقِ کریمانہ، حسنِ معاملہ، راست بازی، صدق و دیانت کی وجہ سے اتنے زیادہ مشہور ہو چکے تھے کہ خلقِ خدا میں آپ ''صادق وامین'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے، لوگ کھلے اعتماد کے ساتھ آپ کے پاس بے دھڑک اپنی امانتیں رکھواتے تھے، انھیں خصائل کی بنا پر حضرت خدیجہ بن خویلد رضی اللہ عنہا کی رغبت نبی اکرم ﷺ کی طرف ہوئی تھی اور پیغامِ نکاح بھیج دیا تھا۔

لڑائی جھگڑے سے پرہیز کرنا

تجارتی معاملات کی کامیابی کے لیے معاملات کی صفائی اور لڑائی جھگڑے سے پرہیز اہم ترین کردار ادا کرتا ہے اور یہ صفات نبی اکرم ﷺ میں بدرجۂ اتم موجود تھیں؛ چنانچہ حضرت قیس فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ زمانۂ جاہلیت میں میرے شریک ہوتے تھے، اور آپ ﷺ شرکاء میں سے بہترین شریک تھے، نہ لڑائی کرتے تھے اور نہ ہی جھگڑا کرتے تھے۔ (الإصابة في تمييز الصحابة، القاف بعدها الياء، ۵/ ۴۷۱)

بحث وتکرار سے اجتناب

مسلمان تاجر کی صفات میں سے ایک صفت معاملات کے وقت شور شرابا اور آپس کی بے جا

بحث وتکرار سے بچنا بھی ہے، اور آپ ﷺ کے اس وصف عظیم کی گواہی زمانۂ نبوت سے پہلے بھی دی جاتی تھی؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نبی اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے سامنے میری تعریف اور میرا تذکرہ کرنے لگے، تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تمہاری نسبت ان سے زائد واقف ہوں، میں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یارسول اللہ ﷺ! آپ سچ فرماتے ہیں، آپ زمانۂ جاہلیت میں میرے شریک ہوتے تھے، اور آپ کتنے بہترین شریک ہوتے تھے کہ نہ شور شرابا (بحث وتکرار) کرتے تھے اور نہ جھگڑا کرتے تھے۔ (سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في كراهية المراء، رقم الحديث: ٤٨٣٨)

ایفائے وعدہ

وعدوں کی پاسداری تجّار کی بہت بڑی خوبی شمار ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ کے اندر یہ وصف کیسا تھا؟ اس بارے میں ''حضرت عبداللہ بن ابی حمسآء رجی اللہ عنہ'' سے روایت ہے کہ میں نے نبوت ملنے سے قبل آپ سے خرید وفروخت کا ایک معاملہ کیا، خریدی گئی شئے کی قیمت میں سے کچھ رقم میرے ذمہ باقی رہ گئی، تو میں نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا کہ میں کل اسی جگہ آکر آپ کو بقیہ رقم ادا کردوں گا، پھر میں بھول گیا، اور مجھے تین روز بعد یاد آیا، میں اس جگہ گیا، تو دیکھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ اسی جگہ تشریف فرما ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اے نوجوان! تم نے مجھے اذیت پہنچائی، میں تین دن سے اسی جگہ پر تمہارا منتظر ہوں۔ (سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في العدة، رقم الحديث: ٤٩٩٨)

نبوت کے بعد معاشی صورتِ حال

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے نبوت مل جانے کے بعد حصول معاش کے لیے کچھ کیا یا نہیں؟ اس بارے میں بالاتفاق قولِ فیصل یہ ہے کہ بعثت کے بعد آپ ﷺ نے اپنی محنت اور توجہ صرف اور صرف احیائے دینِ متین کی طرف مبذول کردی تھی، بعثت کے بعد آپ ﷺ سے کسی بھی قسم کی معاشی مشغولیت کا ثبوت نہیں ملتا ہے؛ البتہ! دین کے دیگر شعبوں کی طرف راہنمائی کی طرح اس شعبے کی بھی بہت واضح اور تفصیلی انداز میں راہنمائی کی، اس میدان سے کامیابی کے ساتھ

گذر جانے والوں کو جہاں بہت بڑی بڑی بشارتیں سنائیں تو وہاں اس میدان کے چور، ڈاکوؤں اور خائنوں کو وعیدیں سنا سنا کر انھیں لوٹ آنے کی طرف بھی متوجہ کیا، نبی اکرم ﷺ کے فرمودات کا جائزہ لیا جائے تو عبادت کے احکام اور معاملات کے احکام میں ایک اور تین کی نسبت نظر آئے گی، یعنی: عبادات سے متعلق احکام ایک ربع اور معاملات سے متعلق احکام تین ربع ملیں گے؛ چنانچہ کتبِ فقہ میں اہم ترین کتاب ''ہدایہ'' کو دیکھ لیا جائے کہ اس کی چار ضخیم جلدوں میں سے صرف ایک جلد عبادات کے بارے میں ہے اور تین جلدیں معاملات کے بارے میں ہیں، اسی سے شعبۂ معاملات کی اہمیت کا اندازہ کرلیا جائے۔

ایک غلط ذہن کی اصلاح

موجودہ دور میں ایک طبقہ کم عقلی اور کم علمی کی وجہ سے یہ ذہن رکھتا ہے کہ محنت کرنے اور کمانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ تو رزق دینے میں ہماری محنت کے محتاج نہیں ہیں، وہ ایسے بھی دینے پر قادر ہیں، لہٰذا ہمیں کچھ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم تو اعمال کے ذریعے اللہ سے لیں گے، اسباب کے ذریعے نہیں۔

تو اس بارے میں اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ایک ہے اسباب کا اختیار کرنا اور انھیں استعمال کرنا، اور ایک ہے ان اسباب کو دل میں اتارنا، اور ان پر یقین رکھنا؛ پہلی چیز کو اپنانا محمود اور مطلوب ہے اور دوسری چیز کو اپنانا مذموم ہے، ہماری محنت کا رُخ یہ ہونا چاہیے کہ ہم ان اسباب کی محبت اور یقین دل سے نکالیں اور اس کے برعکس یقین اللہ تعالیٰ پر رکھیں کہ ہماری ہر طرح کی ضروریات پوری کرنے والی ذات؛ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہ چاہے تو اسباب کے ذریعے ہماری حاجات وضروریات پوری کردے اور چاہے تو ان اسباب کے بغیر محض اپنی قدرت سے ہماری ضروریات وحاجات پوری کردے، وہ اس پر پوری طرح قادر اور خودمختار ہے؛ البتہ ہم دنیا میں اسباب اختیار کرنے کے پابند ہیں؛ تاکہ بوقتِ حاجت وضرورت ہماری نگاہ وتوجہ غیر اللہ کی طرف نہ اٹھ جائے۔

اس بات میں تو کوئی شک وشبہ ہے ہی نہیں کہ اللہ رب العزت ہماری محنتوں کے محتاج نہیں ہیں؛ لیکن کیا شریعت کا مزاج اور منشا بھی یہی ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں، بالخصوص جب اس ترکِ اسباب کا نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ بیوی، بچوں اور والدین کے حقوق تلف ہوتے ہیں اور یہ غیروں

کے اموال کی طرف حرص وہوس کے ساتھ دیکھتا رہتا ہے، تو یاد رکھیں کہ اس طرح کے لوگوں کو شریعت اس طرزِ عمل کی تعلیم نہیں دیتی؛ بلکہ سیرتِ نبوی اور سیرتِ صحابہ تو حلال طریقے سے کسبِ معاش کی تعلیم دیتی ہے، ایسے بے شمار واقعات ہیں جن سے یہ سبق ملتا ہے کہ کما کر کھاؤ، دوسرے کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تونگری کی وجہ سے آج کے دور میں ہمارا دین وایمان محفوظ رہے گا، ورنہ اندیشہ ہے کہ اختیاری فقر وفاقہ کہیں کفر وشرک کے قریب ہی نہ لے جائے۔ ہاں! اولیاء اللہ اور یقین وتوکل کے اعلیٰ درجہ پر فائض لوگوں کا معاملہ اور ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کی ذریں نصائح

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گذشتہ زمانہ میں مال کو بُرا سمجھا جاتا تھا؛ لیکن جہاں تک آج کے زمانہ کا تعلق ہے تو اب مال ودولت مسلمانوں کی ڈھال ہے، حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر یہ درہم ودینار اور روپیہ پیسہ نہ ہوتا تو یہ سلاطین وامراء ہمیں رومال بنا کر ذلیل وپامال کرڈالتے، نیز! انہوں نے فرمایا: کسی شخص کے پاس اگر تھوڑا بہت بھی مال ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کی اصلاح کرے؛ کیوں کہ ہمارا یہ زمانہ ایسا ہے کہ اس میں اگر کوئی محتاج ومفلس ہوگا تو اپنے دین کو اپنے ہاتھ سے گنوانے والا سب سے پہلا شخص وہی ہوگا۔ (حلیة الأولیاء طبقات الأصفیاء، سفیان الثوري، ٦/ ٣٨١)

توضیحات شرح مشکاۃ میں لکھا ہے: پچھلے زمانہ میں مال ودولت کو ناپسند کیا جاتا تھا، مؤمن اور متقی حضرات مال کو مکروہ سمجھتے تھے؛ کیوں کہ عام ماحول زہد وتقویٰ کا تھا، لوگ غریب وفقیر کو ذلیل وفقیر نہیں سمجھتے تھے، مالی کمزوری کی وجہ سے اس کے ایمان کو تباہ نہیں کرتے تھے، نیز بادشاہ اور حکمران بھی اچھے ہوتے تھے، جو غریب کو سنبھالا دیتے تھے؛ اس لیے لوگ مال ودولت اکٹھا نہیں کرتے تھے اور اکٹھا کرنے کو معیوب سمجھتے تھے؛ مگر اب معاملہ اس کے برعکس ہے کہ غریب وفقیر آدمی کو معاشرہ میں ذلیل وحقیر سمجھتے ہیں، اور پیسے کی بنیاد پر اس کے ایمان کو خریدا جاتا ہے، نیز حکمران بھی خیر خواہ نہیں رہے، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ غریب آدمی مالداروں اور حکمرانوں کا دستِ نگر اور دست وپاہ بن جائے گا، اور ان کے ہاتھ صاف کرنے اور میل کچیل صاف کرنے کے لیے تولیہ اور رومال بن جائے گا۔

پھر مزید لکھا ہے: جس شخص کے پاس اس مال میں سے کچھ بھی ہو وہ اس کی اصلاح کرے،

مطلب یہ کہ تھوڑا پیسہ بھی ہو تو اس کو کسی کاروبار میں لگا دے، یہ اس کی ترقی و بڑھوتری ہے، یا پھر اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ اس کو قناعت کے ساتھ خرچ کرے، اسراف نہ کرے۔ (۷/۳۷۵، مکتبہ عصریہ، کراچی)

کمائی کے ذرائع

کسبِ معاش کے بہت سے ذرائع ہیں، ان میں سے کون سا افضل ہے؟! اس کی تعیین میں سلفِ صالحین کا اختلاف ہے، اس بارے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کی ایک بہترین کتاب ''فضائل تجارت'' سے خلاصۃً کچھ بحث ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک کمائی کے ذرائع تین ہیں: تجارت، زراعت اور اجارہ۔ اور ہر ایک کے فضائل میں بہت کثرت سے احادیث ہیں، بعض حضرات نے صنعت وحرفت کو بھی اس میں شامل کیا ہے، جیسا کہ اوپر گذرا۔ میرے نزدیک وہ ذرائع آمدنی میں نہیں، اسبابِ آمدنی میں ہے اور آمدنی کے اسباب بہت سے ہیں: ہبہ ہے، میراث ہے، صدقہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جنہوں نے اس کو کمائی کے اسباب میں شمار کیا، میرے نزدیک صحیح نہیں؛ اس لیے کہ نرا صنعت وحرفت کمائی نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر ایک شخص کو جوتے بنانے آتے ہیں یا جوتے بنانے کا پیشہ کرتا ہے، وہ جوتے بنا بنا کر کوٹھی بھر لے، اس سے کیا آمدنی ہوگی؟ یا تو اس کو بیچے گا یا (پھر یہ جوتے) کسی کا نوکر ہو کر اس کا (مال) بنائے۔ یہ دونوں طریقے تجارت یا اجارہ میں آ گئے، اور اس سے بھی زیادہ قبیح ''جہاد'' کو کمائی کے اسباب میں شمار کرنا ہے؛ اس لیے کہ جہاد میں اگر کمائی کی نیت ہوگئی تو جہاد ہی باطل ہے..... میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میرے نزدیک تجارت افضل ہے، وہ بحیثیت پیشہ کے ہے؛ اس لیے کہ تجارت میں آدمی اپنے اوقات کا مالک ہوتا ہے، تعلیم وتعلم، تبلیغ، افتاء وغیرہ کی خدمت بھی کرسکتا ہے، لہٰذا اگر اجارہ دینی کاموں کے لیے ہو تو وہ تجارت سے بھی افضل ہے؛ اس لیے کہ وہ واقعی دین کا کام ہے؛ مگر شرط یہ ہے کہ وہی دین کا کام مقصود ہو اور تنخواہ بدرجۂ مجبوری ہے۔ میرے اکابرِ دیوبند کا زیادہ معاملہ اسی کا رہا، اور اس کا مدار اِس پر ہے کہ کام کو اصل سمجھے اور تنخواہ کو اللہ کا عطیّہ؛ اس لیے اگر کسی جگہ پر کوئی دینی کام کر رہا ہو، تدریس، افتاء وغیرہ اور اس سے زیادہ کسی دوسرے مدرسہ میں تنخواہ ملے، تو پہلی جگہ کو محض کثرتِ تنخواہ کی وجہ سے نہ چھوڑے۔ میں نے جملہ

اکابر کا یہ معمول بہت اہتمام سے ہمیشہ دیکھا، جس کو آپ بیتی نمبر ۶، صفحہ ۱۵۵ میں لکھوا چکا ہوں کہ انہوں نے اپنی تنخواہوں کو ہمیشہ اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھا.....درحقیقت میرے اکابر کے بہت سے واقعات اس کی تائید میں ہیں کہ تنخواہ اصل یا معتد بہ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا میں نے اوپر لکھا اور تنخواہ محض عطیۂ الٰہی سمجھتے تھے، جو ہم لوگوں میں بالکل مفقود ہے، یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر میں اجارۂ تعلیم کو سب انواع سے افضل لکھا ہے۔ .....اس ملازمت کے بعد تجارت افضل ہے؛ اس لیے کہ تاجر اپنے اوقات کا حاکم ہوتا ہے، وہ تجارت کے ساتھ دوسرے دینی کام تعلیم، تدریس، تبلیغ وغیرہ بھی کرسکتا ہے، اس کے علاوہ تجارت کی فضیلت میں مختلف آیات واحادیث ہیں؛ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إن اللّٰه اشترىٰ من المؤمنين أنفسهم وأموالهم بأن لهم الجنة﴾(التوبة: ۱۱۱)

خدا نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں، (اور اس کے) عوض میں اُن کے لیے بہشت (تیار) کی ہے۔

اور بھی بہت سی آیات تجارت کی فضیلت میں ہیں، ان کے علاوہ احادیث میں ہے:

"التاجرُ الصدوقُ الأمينُ مع النبيينَ والصديقينَ والشهدآءِ".(سنن الترمذي، كتاب البيوع، التجار وتسمية النبي ﷺ إياهم، رقم الحديث:۱۲۰۹)

سچا، امانت دار تاجر (قیامت میں) انبیاء، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔

"إنّ أَطْيَبَ الْكَسْبِ كَسْبُ التُّجَّارِ الَّذِيْنَ إذَا حَدّثُوْا لَمْ يَكْذِبوا، وَإذَا ائْتُمِنُوْا لَمْ يَخُوْنُوْا، وإذَا وَعَدُوا لَمْ يُخْلِفوا، وإذَا اشْتَرَوْا لَمْ يَذُمُّوْا، وَإذَا بَاعُوا لَمْ يَمْدَحُوْا، وَإذَا كَانَ عَلَيْهِمْ لَمْ يَمْطُلُوا، وَإذَا كَانَ لَهُمْ لَمْ يُعَسِروا".(شعب الإيمان للبيهقي، الرابع والثلاثون من شعب الإيمان وهو باب في حفظ اللسان، رقم الحديث: ٤٨٥٤)

بہترین کمائی اُن تاجروں کی ہے، جو جھوٹ نہیں بولتے، امانت میں خیانت نہیں کرتے، وعدہ خلافی نہیں کرتے اور خریدتے وقت چیز کی مذمت نہیں کرتے (تاکہ بیچنے والا قیمت کم کرکے دے دے) اور جب (خود) بیچتے ہیں، تو (بہت زیادہ) تعریف نہیں کرتے (تاکہ زیادہ ملے) اور اگر ان کے ذمہ کسی کا کچھ نکلتا ہو تو ٹال مٹول نہیں کرتے اور اگر خود ان کا کسی کے ذمہ نکلتا ہو تو وصول کرنے میں تنگ نہیں کرتے۔

عن أنس رضي اللّٰه عنه قال: قال رسول اللهﷺ: "التاجِرُ الصَّدُوْقُ تَحْتَ ظِلِّ

الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ". (اتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة، كتاب الفتن، باب في التلاعن وتحريم دم المسلم، رقم الحديث:٧٧٥٢)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سچ بولنے والا تاجر قیامت میں عرش کے سایہ میں ہوگا۔

عن أبي أمامة رضي الله عنه أنَّ رسولَ اللّٰهِ ﷺ قال: "إن التاجرَ إذَا كَانَ فيه أربعُ خِصَالٍ طَابَ كَسْبُهُ، إذا اشْتَرىٰ لَمْ يذُمَّ، وَإذَا بَاعَ لَمْ يَمْدَحْ، وَلَمْ يَدْلُسْ فِي الْبَيْعِ، وَلَمْ يَحلِفْ فِيمَا بَيْنَ ذٰلك". (الترغيب والترهيب، كتاب البيوع، باب فضل التاجر الأمين والترغيب في الصدق في المعاملة، رقم الحديث: ٧٩٧)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تاجر میں چار باتیں آجائیں تو اس کی کمائی پاک ہوجاتی ہے، جب خریدے تو اس چیز کی مذمت نہ کرے اور بیچے تو (اپنی چیز کی بہت زیادہ) تعریف نہ کرے۔ اور بیچنے میں گڑبڑ نہ کرے اور خرید وفروخت میں قسم نہ کھائے۔

وعن حكيم بن حزامٍ رضي الله عنه أن رسولَ اللّٰهِ ﷺ قال: "اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا، فإنْ صَدَقَا وَبَيَّنا بُورِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا، وإنْ كَتَمَا وَكَذَبا، فعسىٰ أن يربَحا رِبحاً، ويَمْحَقَا برَكَةَ بَيْعِهِمَا". (صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب كان البائع بالخيار هل يجوز البيع، رقم الحديث: ٢١١٤)

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کہ خرید وفروخت کرنے والے کو (بیع توڑنے کا) حق ہے، جب تک وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ اگر بائع ومشتری سچ بولیں اور مال اور قیمت کے عیب اور کھرے کھوٹے ہونے کو بیان کردیں تو ان کی بیع میں برکت ہوتی ہے اور اگر عیب کو چھپالیں اور جھوٹے اوصاف بتائیں تو شاید کچھ نفع تو کمالیں (لیکن) بیع کی برکت ختم کردیتے ہیں۔

قال المناوي: رجاله ثقات، "تِسْعَةُ أَعْشَارِ الرِّزْقِ في التِّجَارَةِ، وَالْعُشُرُ في المَوَاشِيُ، يعنى: النَّتَاج". (نظام الحكومة النبوية المسمىٰ التراتيب الإدارية، المقدمة الخامسة: باب ما ذكر في الأسواق، ١٢/٢)

مناوی فرماتے ہیں: رزق کے نو حصے تجارت میں ہیں اور ایک حصہ جانوروں کی پرورش

میں ہے۔

أخرج الديلمي عن ابن عباس رضي الله عنهما: "أَوْصِيكُمْ بِالتُّجَارِ خَيْرًا، فإِنَّهُمْ بُرُدُ الآفاق وأُمَنَاءُ اللّٰهِ في الأرض". (نظام الحكومة النبوية المسمىٰ التراتيب الإدارية، المقدمة الخامسة: باب ما ذكر في الأسواق، ۱۲/۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں تمہیں تاجروں کے ساتھ خیر کے برتاؤ کی وصیت کرتا ہوں؛ کیوں کہ یہ لوگ ڈاکیے اور زمین میں اللہ کے امین ہیں۔

تجارت کے بعد میرے نزدیک زراعت افضل ہے، زراعت کے متعلق حدیث میں آیا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا کہ: ''کوئی مسلمان جو درخت لگائے یا زراعت کرے، پھر اس میں سے کوئی انسان یا پرندہ یا کوئی جانور کھالے تو یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔ اور مسلم کی روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اس میں سے کچھ چوری ہوجائے تو وہ بھی اس کے لیے صدقہ شمار ہوتا ہے۔

اور ضرورت کے اعتبار سے بھی زراعت اہم ہے؛ کیوں کہ اگر زراعت نہ کی جائے تو کھائیں گے کہاں سے؟!..... باقی اپنی زمین دوسرے کو دینا، مزارعت کہلاتا ہے، زراعت اور چیز ہے اور مزارعت اور چیز ہے۔ حاصل یہ ہے کہ قواعدِ شرعیہ کی رعایت ہر چیز میں ضروری ہے، جیسا کہ اس بارے میں أوجز المسالک: ۲۲۰/۵، باب کراء الأرض میں بہت لمبی بحث کی گئی ہے۔ اور شرعی حدود کی رعایت ان ہی تینوں میں نہیں؛ بلکہ دین کے ہر معاملہ میں ضروری ہے۔..... ان سب کے بعد نہایت ضروری اور اہم امر یہ ہے کہ کسب کے؛ بلکہ ہر عمل میں شریعتِ مطہرہ کی رعایت ضروری ہے، جس کو احیاء العلوم: ۶۴/۲ میں مستقل باب کے تحت بیان کیا ہے؛ چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''بیع اور شراء کے ذریعہ مال حاصل کرنے کے مسائل سیکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے، جو اس مشغلہ میں لگا ہوا ہو؛ کیوں کہ طلبِ علم کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس سے ان تمام مشاغل کا علم طلب کرنا مراد ہوگا، مشغلہ رکھنے والوں کو جن مسائل کی حاجت ہو۔ اور کسب کرنے والا کسب کے مسائل جاننے کا محتاج ہے اور جب اس سلسلہ کے احکام جان لے تو معاملات کو فاسد کرنے والی چیزوں سے واقف ہوجائے گا، لہٰذا ان سے بچے گا، اور ایسے شاذ و نادر مسائل جو باعث اشکال ہوں، ان کے ہوتے ہوئے معاملہ کرنے میں

سوال کر کے علم حاصل کرنے تک توقف کرے گا؛ کیوں کہ جب کوئی شخص معاملات کو فاسد کرنے والے امور کو اجمالی طور پر نہ جانے تو اسے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ میں کس کے بارے میں توقف کروں اور سوال کر کے اس کو جانوں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں پیشگی علم حاصل نہیں کرتا، اس وقت تک کام کرتا رہوں گا؛ جب تک کوئی واقعہ پیش نہ آجائے، جب کوئی واقعہ پیش آئے گا تو معلوم کرلوں گا، تو اس شخص کو جواب دیا جائے گا کہ جب تک تو اِجمالی طور پر معاملات کو فاسد کرنے والی چیزوں کو نہ جانے گا تجھے کیسے پتہ چلے گا کہ مجھے فلاں موقع پر معلوم کرنا چاہیے۔ جسے اجمالی علم بھی نہ ہو وہ برابر تصرفات کرتا رہے گا اور ان کو صحیح سمجھتا رہے گا۔ لہٰذا علم تجارت سے اوّلا اس قدر جاننا ضروری ہے کہ جس سے جائز وناجائز میں تمیز ہو اور یہ پتہ چل سکے کہ کون سا معاملہ وضاحت کے ساتھ جائز ہے اور صحیح ہے، اور کس میں اشکال ہے۔'' (ملخص من فضائل تجارت، ص: ۴۸-۷۲، مکتبۃ البشریٰ)

اِن تفصیلات کے بعد ہم سب کے لیے از حد ضروری ہے کہ ہم حدودِ شرعیہ کے اندر رہتے ہوئے کسبِ معاش کریں، اور حصول معاش سے قبل اس کا علم شرعی ضرور بالضرور حاصل کرلیں، مبادا یہ کہ یہ کمائی کل بروزِ قیامت ہمارے لیے وبال بن جائے اور ہماری آخرت برباد ہوجائے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے بازار میں وہی شخص خرید وفروخت کیا کرے، جس نے اپنے اس کاروبار سے متعلق علم حاصل کرلیا ہو۔

"لَا يَبِيعُ فِي سُوقِنَا إِلّا مَنْ قَدْ تَفَقَّهَ فِي الدِّيْنِ". (سنن الترمذي، كتاب الصلاة، أبواب الوتر، فضل الصلاة على النبي، رقم الحديث: ٤٨٧)

اللہ رب العزت زندگی کے ہر ہر شعبے میں احکامات معلوم کر کے ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

"اللهم انفَعْنا بما علّمْتَنا وعلِّمْنا ما يَنفَعُنا وارزُقْنا علماً تنفَعُنا به".

❁ ❁ ❁

ولادتِ نبوی ۱۲؍ربیع الاوّل اور وفات ۲؍ربیع الاوّل
ایک تحقیق

از: مولانا محمد شفیع قاسمی بھٹکلی
ناظم ادارہ رضیۃ الابرار، بھٹکل

قدیم زمانہ سے یہ بات مشہور ومعروف ہے کہ آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیدائش پیر کے دن ۱۲؍ربیع الاول کو ہوئی۔ اور ۱۲؍ربیع الاوّل کو برصغیر میں حکومت کی طرف سے چھٹیاں بھی ہوتی ہیں؛ مگر افسوس کہ کچھ لوگ تاریخ ولادت کے بارے میں ایک مہم چلائے ہوئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ۱۲؍ربیع الاول کو نہیں ہوئی؛ بلکہ آٹھ (۸) یا نو (۹) کو ہوئی، اور کچھ مصنّفین کے اقوال دلیل میں پیش کرتے ہیں؛ مگر سچ بات یہ ہے کہ جمہور علماء اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی تاریخ پیدائش ۱۲؍ربیع الاول ہی ہے۔ سیکڑوں علماء کے اقوال کتابوں میں موجود ہیں۔ لہٰذا صحیح تاریخ ولادت کے متعلق علماء امت کے اقوال کا نقل کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی پیدائش ۱۲؍ربیع الاول کو ہوئی۔

(۲) مشہور مؤرخ امام محمد بن اسحاقؒ فرماتے ہیں: وُلِدَ رسولُ اللّٰہ ﷺ یومَ الاثنین لاثنتی عشرة (۱۲) لیلةً خَلَتْ مِنْ شَھْرِ ربیعِ الأول عامَ الفیل.(السیرة النبویة لابن ھشام۱/ ۲۸٤،تاریخ الطبری۲/ ۱٥٦، مستدرك حاکم٤۱۸۲، شعب الایمان للبیھقی ۱۳۲٤، الکامل فی التاریخ لابن الاثیر۱/ ۲۱٦)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ربیع الاول کی بارہویں رات عام فیل (۵۷۱ عیسوی) میں ہوئی۔

(۳) مشہور مؤرخ ومحدث امام ابوحاتم ابن حبانؒ (متوفی ۳۵۴ ہجری) لکھتے ہیں:
وُلِدَ النبیُّ ﷺ عامَ الفیل یومَ الاثنین لاثنتی عشرة (۱۲) لیلةً مَضَتْ من شھر

ربیعِ الأول. (السیرۃ لابن حبان ۱/۳۳)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ربیع الاول کی بارہویں رات عام فیل (۵۷۱ عیسوی) میں ہوئی۔

(۴) امام ابوالحسن ماوردی شافعیؒ (متوفی ۴۵۰ ہجری) لکھتے ہیں:

وُلِدَ بعدَ خمسین یوماً من الفیل وبعدَ موتِ أبیہ فی یومِ الاثنین الثانی عشر من شھر ربیع الاول. (أعلام النبوۃ ۱/ ۲۴۰)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کی پیدائش اپنے والد کے انتقال کے بعد، اور واقعہ فیل کے پچاس دن بعد پیر کے دن ۱۲/ ربیع الاول کو ہوئی۔

(۵) علامہ قسطلانیؒ (متوفی ۹۲۳ ہجری) لکھتے ہیں:

والمشھورُ أنہ وُلِدَ یومَ الاثنین ثانی عشر(۱۲) شھر ربیع الأول، وھو قول ابن إسحاق وغیرہ. (المواھب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ ۱/ ۸۵)

ترجمہ: مشہور قول کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی ولادت ۱۲/ ربیع الاول پیر کے دن ہوئی۔ اور یہی قول حضرت ابن اسحاقؒ (تابعی) وغیرہ کا ہے۔

(۶) شیخ محمد بن عمر بحرق حضرمی شافعیؒ (متوفی ۹۳۰ ہجری) لکھتے ہیں:

قال علماء السیر: ولد النبی ﷺ فی ربیع الأول یوم الاثنین بلا خلافٍ. ثم قال الأکثرون: لیلۃ الثانی عشر(۱۲) منہ. (حدائق الأنوار ومطالع الأسرار ۱/ ۱۰۵)

ترجمہ: علماء سیرت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ربیع الاول کے مہینہ پیر کے دن ہوئی، اور جمہور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ۱۲/ ربیع الاول کی تاریخ تھی۔

(۷) علامہ مناویؒ (متوفی ۱۰۳۱ ہجری) لکھتے ہیں:

الأصحُّ أنہ وُلِدَ بمکۃَ بالشِّعَبِ بعدَ فجرِ الاثنین ثانی عشر ربیع الاول عام الفیل. (فیض القدیر ۳/ ۵۷۳)

ترجمہ: صحیح بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ بارہ ربیع الاول کی صبح شعب مکہ میں واقعۂ فیل کے سال پیر کے دن پیدا ہوئے۔

(۸) علامہ ابوعبداللہ محمد زرقانی مالکیؒ (متوفی ۱۱۲۲ ہجری) المواھب اللدنیۃ کی شرح میں لکھتے ہیں۔

(والشهور أنه ﷺ وُلِدَ يومَ الاثنين ثانی عشر ربيع الاول، وهو قول محمد بن إسحاق) بن يسار إمام المغازی، وقول (غيره) قال ابن كثير: وهو المشهور عند الجُمُهور، وبالغَ ابن الجوزی وابن الجزار فنقلاً فيه الإجماعَ. (شرح الزرقانی على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية ٢٤٨/١)

ترجمہ: مشہور قول کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی ولادت بارہ (۱۲) ربیع الاول پیر کے دن ہوئی۔ اور یہی قول مغازی اور سیرت کے امام حضرت محمد ابن اسحاق بن یسارؒ (تابعی) اور دیگر اہل علم کا ہے، علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں جمہور کا یہی قول ہے، علامہ ابن جوزیؒ اور ابن جزارؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

(۹) حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی ۱۳۶۲ہجری) لکھتے ہیں:

جمہور کے قول کے موافق بارہ (۱۲) ربیع الاول تاریخ ولادت شریفہ ہے۔ (ارشاد العباد فی عيد الميلاد، ص ۵)

(۱۰) حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ (متوفی ۱۳۷۳ہجری) لکھتے ہیں:

پیدائش ۱۲ر تاریخ، ربیع الاول کے مہینہ میں پیر کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ سو اکہتر (۵۷۱) برس بعد ہوئی۔ سب گھر والوں کو اس بچے کے پیدا ہونے سے بڑی خوشی ہوئی۔ (رحمت عالم، ص ۱۵)

(۱۱) حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۹۶ہجری) صدر مفتی دارالعلوم دیوبند ومفتی اعظم پاکستان لکھتے ہیں:

الغرض جس سال اصحابِ فیل کا حملہ ہوا، اس کے ماہ ربیع الاول کی بارہویں تاریخ روز دوشنبہ دنیا کی عمر میں ایک نرالا دن ہے کہ آج پیدائش عالم کا مقصد، لیل ونہار کے انقلاب کی اصل غرض، آدم علیہ السلام اور اولاد آدم کا فخر، کشتی نوح علیہ السلام کی حفاظت کا راز، ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور موسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی کا مصداق یعنی ہمارے آقائے نامدار محمد ﷺ رونق افروزِ عالم ہوتے ہیں۔ (سیرت خاتم الانبیاء، ص ۱۱)

(۱۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۱۳۹۹ہجری) لکھتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ربیع الاول میں ہوئی، ولادت پیر کے روز ہوئی، یہ بات خود رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی کے سوال پر بیان فرمائی، (صحیح مسلم بروایت قتادہ)، ربیع الاول کی تاریخ

کون سی تھی؟ اس میں اختلاف ہے؛ لیکن ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ ۱۲؍ربیع الاول کو پیدا ہوئے تھے، اسی کی تصریح محمد بن اسحاق نے کی ہے، اور جمہور اہل علم میں یہی تاریخ مشہور ہے۔ (سیرت سرور عالم، جلد دوم، صفحہ ۹۴،۹۳)

(۱۳) حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) (متوفی ۱۴۱۷ ہجری) لکھتے ہیں:

حضرت عبداللہ کی شادی حضرت آمنہ بنت وہب سے ہوئی، جو بنی زہرہ کے خاندان سے تھیں، اس مبارک ومسعود شادی کے بعد شہر مکہ میں حضرت آمنہ کے بطن سے دوشنبہ ۱۲؍ربیع الاول مطابق ۲۰؍اپریل ۵۷۱ عیسوی کی صبح کے وقت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولادت باسعادت ظہور پذیر ہوئی۔ (گلدستہ سلام، ص ۱۸)

(۱۴) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (متوفی ۱۴۲۰ ہجری) لکھتے ہیں:

وَوُلِدَ رسولُ اللّٰہ ﷺ یومَ الاثنین الیومَ الثانی عشر من شھرِ ربیعِ الأول، عامَ الفیل أسعدَ یوم طلعت فیه الشمس. (السیرة النبویة، ص ۱۱۱)

(۱۵) فتاویٰ لجنہ دائمہ میں ہے:

وُلِدَ النبی ﷺ یومَ الاثنین لاثنتی عشرة (۱۲) لیلةً مَضَتْ مِن شھرِ ربیعِ الاول عامَ الفیل. (فتاوی اللجنة الدائمة، فتوی رقم ۳٤۷٤)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ربیع الاول کی بارہویں رات عام فیل (۵۷۱ عیسوی) میں ہوئی۔

طوالت کے خوف سے صرف پندرہ علماء کے اقوال پر اکتفا کیا گیا ہے۔ نو (۹) ربیع الاول کے قول کی تردید میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع کی کتاب سیرت خاتم الانبیاء کے حاشیہ میں اس طرح لکھا ہے: مشہور قول بارہویں (۱۲) تاریخ کا ہے؛ یہاں تک کہ ابن الجزارؒ نے اس پر اجماع نقل کردیا ہے، اور اسی کو کامل ابن اثیر میں اختیار کیا گیا ہے، اور محمود پاشا علی مصری نے جو نویں تاریخ کو بذریعۂ حساب اختیار کیا ہے، یہ جمہور کے خلاف بے سند قول ہے اور حسابات پر بوجہِ اختلافِ مطالع ایسا اعتماد نہیں ہوسکتا ہے کہ جمہور کی مخالفت اس بناء پر کی جائے۔ (حاشیہ سیرت خاتم الانبیاء، ص ۱۱)

محمود پاشاہ صاحب نے حساب سے ۹؍ربیع الاول، عام فیل کو پیر کا دن قرار دیا ہے، یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے، ہمارے حساب سے ۱۲؍ربیع الاول، عام فیل مطابق ۲۳؍اپریل ۵۷۱ عیسوی کو پیر کا دن پڑتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ بعض اہلِ تحقیق نے اسے ۲۳؍اپریل ۵۷۱ء کے مطابق قرار دیا ہے۔ (سیرت سرور عالم، جلد دوم، صفحہ ۹۴)

بعضوں نے البدایۃ والنہایۃ کے حوالہ سے ۸؍ربیع الاول کو راجح لکھا ہے۔ شاید بدایۃ میں پوری بحث پڑھنے کی ان کو فرصت نہیں ملی، اسی بدایۃ میں: قیل لثنتی عشرةَ..... وَهٰذا هو المشهورُ عندَ الجمهور لکھا ہوا ہے۔ اس میں صاف طور پر لکھا ہے کہ بارہ (۱۲) ربیع الاول کا قول جمہور کا قول ہے۔ رہا روایت میں الثامن عشر کا لفظ، بارہ ربیع الاول کے مخالف لوگوں کی مہربانی یا کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے؛ اس لیے کہ مصنف ۱۲؍ربیع الاول کے قول کی دلیل میں یہ روایت نقل کررہے ہیں، ۱۲؍ربیع الاول کے قول میں ۱۸؍کی روایت نقل کرنا مصنف کے مدعا کے خلاف ہے، نیز مصنف نے اپنی دوسری کتاب السیرة النبوية میں اسی روایت کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ عَنْ جَابِرٍ وَابنِ عباسٍ أَنَّهُمَا قالَا: وُلِدَ رسولُ اللّٰه ﷺ عامَ الفيل يومَ الاثنين الثانی عَشَرَ من شهرِ ربيعِ الاول.... نیز البدایۃ والنہایہ کے مکتبہ المعارف بیروت سے شائع ہونے والے نسخہ کے حاشیہ میں اس طرح لکھا ہے: كذا رأيته الثامن عشر، والصوابه الثانی عشر۔ لہٰذا اہل علم حضرات سے گذارش ہے کہ کسی ایک کتاب کو دیکھ کر فیصلہ نہ کریں؛ بلکہ دوسری کتابوں سے بھی تحقیق کریں۔ آج کل حدیث کی کتابوں میں تحریف وتبدیل کا سلسلہ جاری ہے۔ شاملہ کے ایک نسخہ میں حدیث کے الفاظ دوسرے شاملہ کے الفاظ سے مختلف یا حذف ہیں۔ ہمارے خیال میں جس وقت آپ ﷺ مکہ میں پیدا ہوئے، اس وقت مکہ میں ۱۲؍ربیع الاول کی تاریخ تھی، اور دوسرے علاقوں میں دوسری تاریخ تھی، کیونکہ قمری تاریخ مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے۔ غرض جس دن آپ ﷺ پیدا ہوئے اس وقت مکہ میں ۱۲؍ربیع الاول کی تاریخ تھی۔ لہٰذا صحیح، مشہور اور راجح قول کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ۱۲؍ربیع الاول ہی کو ہوئی۔

رہا ۱۲؍ربیع الاول کو تاریخِ وفات کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات پیر کے دن ہوئی، اور صحیح بخاری ہی کی روایت میں منقول ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ کا دن جمعہ کا دن تھا، اور ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفہ کے اکیاسی (۸۱) دن کے بعد آپ ﷺ کی وفات ہوئی۔ اس حساب سے ۱۲؍ربیع الاول کو پیر کا دن

کسی طرح نہیں پڑتا ہے، لہٰذا علامہ ابن حجر عسقلانیؒ ہی کی رائے کو ماننا پڑے گا کہ آپ کی وفات دو (۲) ربیع الاول بروز پیر کو ہوئی۔

علامہ سہیلی (متوفی ۵۸۱ھ) نے روض الانف میں، علامہ تقی الدین ابن تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ) نے منہاج السنۃ میں، علامہ شبلی نعمانی سیرت النبی میں یکم ربیع الاول لکھا ہے۔ اور علامہ مغلطائی، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں، شیخ محمد بن عمر بحرقی حضرمی شافعیؒ (متوفی ۹۳۰ ہجری) نے حدائق الانوار میں، مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ (مفتی اعظم پاکستان) نے سیرت خاتم الانبیاء میں، میاں عابد احمد نے شانِ محمد ﷺ میں دوم ربیع الاول لکھا ہے، سیرت خاتم الانبیاء کے حاشیہ میں لکھا ہے۔ تاریخ وفات میں مشہور یہ ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو واقع ہوئی اور یہی جمہور مورخین لکھتے چلے آئے ہیں؛ لیکن حساب سے کسی طرح بھی یہ تاریخ وفات نہیں ہوسکتی ہے؛ کیوں کہ یہ بھی متفق علیہ اور یقینی امر ہے کہ وفات دوشنبہ کو ہوئی اور یہ بھی یقینی ہے کہ آپ کا حج ۹ ذی الحجہ روز جمعہ کو ہوا ان دونوں باتوں کے ملانے سے ۱۲ ربیع الاول روز دوشنبہ میں نہیں پڑتی؛ اسی لیے حافظ ابن حجرؒ نے شرح صحیح بخاری میں طویل بحث کے بعد اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ تاریخ وفات دوسری ربیع الاوّل ہے، کتابت کی غلطی سے ۲ کا ۱۲ بن گیا۔ حافظ مغلطائیؒ نے بھی دوسری تاریخ کو ترجیح دی ہے۔ واللہ اعلم

بارہ ربیع الاول ۱۱ ہجری کو پیر کا دن کسی حساب سے نہیں پڑتا، اس لحاظ سے رسول اللہ ﷺ کی وفات یکم یا دوم ربیع الاول بروز پیر کو صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ تاریخ ۲۸ مئی ۶۳۲ عیسوی ہوتی ہے۔ جس وقت آپ ﷺ کا وصال ہوا اس وقت مدینہ میں دوم ربیع الاول ۱۱ ہجری مطابق ۲۸ مئی ۶۳۲ عیسوی پیر کا دن تھا اور دوسرے علاقوں میں یکم ربیع الاول ۱۱ ہجری مطابق ۲۸ مئی ۶۳۲ عیسوی پیر کا دن ہوگا۔ اس حساب سے یکم اور دوم ربیع الاول کا اختلاف ختم ہوگا۔ غرض ہر جگہ پر پیر کا دن تھا اور ۲۸ مئی ۶۳۲ عیسوی کی تاریخ تھی، ہجری تاریخ مختلف ملک میں مختلف ہوسکتی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

❁ ❁ ❁

جشنِ عید میلاد النبی ﷺ منع آخر کیوں؟

از: مولانا ندیم احمد انصاری ایم اے
مہتمم مدرسہ نور محمدی، ممبئی

لفظی اعتبار سے ہر اس دن کو عید کہتے ہیں جس میں کسی بڑے آدمی یا کسی بڑے واقعہ کی یاد منائی جائے۔ بعض نے کہا کہ عید کو عید؛ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ہر سال لوٹ کر آتی ہے۔ (المنجد: ۶۹۰، معجم الوسیط: ۶۳۵) ''عید'' کو عید کہنا ایک طرح کی نیک فالی اور اس تمنّا کا اظہار ہے کہ یہ روزِ مسرّت بار بار آئے۔ (قاموس الفقہ: ۴/۴۱۹)

ولادتِ نبوی ﷺ کی صحیح تاریخ

تمام مؤرخین اور اصحابِ سیر کا اس پر تو اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت پیر کے دن ہوئی؛ البتہ تاریخ میں شدید اختلاف ہے۔ ۲، ۸، ۹، ۱۰، اور ۱۲ تاریخیں بیان کی گئی ہیں اور وفات کے سلسلے میں ۲/ ربیع الاول کو جب کہ ولادت کے سلسلے میں ۱۲/ ربیع الاول کو ترجیح دی گئی۔

یومِ ولادتِ نبوی ﷺ

یومِ ولادتِ نبوی ﷺ یعنی اس عظیم الشان شخصیت کا جنم دن، جسے تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ وہ دن واقعی بڑی ہی عظمت و برکت کا حامل تھا؛ اس لیے کہ اس مبارک دن میں رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ اس عالمِ رنگ و بو میں تشریف لائے۔ اگرچہ شریعت نے سالانہ آقا کے یومِ ولادت کو ''منانے'' کا حکم نہیں دیا نہ اسے عید ہی قرار دیا، نہ ہی اس کے لیے کسی قسم کے مراسم مقرّر کیے؛ لیکن جس سال ماہِ ربیع الاول میں یہ دن آیا تھا، وہ نہایت ہی متبرک اور پیارا دن تھا۔ آج جو لوگ اس دن کو ''عید'' کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ اصلاً رسولِ خدا ﷺ کی نافرمانی کرتے ہیں، اس لیے کہ خود ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

اللہ تعالیٰ نے دیگر قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے عید کے دو دن مقرّر کیے ہیں: (۱) عید الفطر اور (۲) عید الاضحیٰ۔ یہ ارشاد اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا تھا جب کہ آپ نے اہلِ

مدینہ کو دوسرے دنوں میں زمانۂ جاہلیت کے طرز پر عید و خوشی مناتے دیکھا۔ (ابوداود: ۱۳۳۴، نسائی: ۱۵۵۷) اس سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہوگیا کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ماننے والوں کے لیے سالانہ صرف دو دنوں کو عید کے طور پر مقرر فرمایا، ان کے علاوہ بعض روایتوں میں جمعہ کے دن کو بھی عید کہا گیا ہے، اس کے علاوہ کسی دن کے متعلق عید کا لفظ وارد نہیں ہوا۔ اب اگر کوئی اس پر زیادتی کرکے اپنی طرف سے مزید ایک دن بڑھاتا اور اس میں عید جیسی خوشیاں مناتا ہے، تو وہ گویا رحمۃ للعالمین ﷺ کے اس ارشادِ عالی پر عدم رضامندی کا اظہار کرتا ہے، اور جو اسے دین کا حصہ سمجھتا ہے، وہ اپنی طرف سے نیا دین تراشتا ہے اور یہ دونوں ہی طریقۂ عمل نہایت خطرناک ہیں۔

عید میلاد النبی ﷺ کی ابتداء

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

یہ مروجہ مجلسِ میلاد قرآن کریم سے ثابت ہے نہ حدیث شریف سے، نہ خلفاءِ راشدین و دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ثابت ہے نہ تابعین وائمہ مجتہدینؒ؛ امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ وغیرہ سے، نہ محدثین؛ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابو داودؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہؒ وغیرہ سے اور نہ اولیاءِ کاملین؛ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ اور شیخ عارف شہاب الدین سہروردیؒ وغیرہ سے۔ چھ صدیاں اس امت پر اس طرح گزر گئیں کہ اس مجلس کا کہیں وجود نہیں تھا۔ سب سے پہلے بادشاہ اربل نے شاہانہ انتظام سے اس کو منعقد کیا اور اس پر بہت مال خرچ کیا، پھر اس کی حرص واتباع میں وزراء وامراء نے اپنے اپنے انتظام سے مجالس منعقد کیں، اس کی تفصیل ''تاریخ ابن خلکان'' میں موجود ہے۔

اسی وقت سے علماءِ حق نے اس کی تردید بھی لکھی ہے؛ چنانچہ ''کتاب المدخل'' میں علامہ ابن الحجاج نے بتیس صفحات میں اس کے قبائح و مفاسد دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں لکھے ہیں۔ ۷۳۷ھ میں اس کی تصنیف سے فراغت حاصل ہوئی، پھر جہاں یہ مجلس پہنچتی گئی، وہاں کے علماء تردید فرماتے رہے؛ چنانچہ عربی، فارسی اور اردو ہر زبان میں اس کی تردید موجود ہے اور آج تک تردید کی جارہی ہے۔ (فتاوی محمودیہ جدید: ۲۱۴/۳-۲۱۳ بتغیر)

بریلوی عالم کا اعتراف

بریلوی حضرات کے ایک عالم قاضی فضل احمد صاحب لکھتے ہیں: ''یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ اس مخصوص شکل سے یہ عملِ خیر و برکت ونعمت ۶۰۴ھ سے جاری ہے''۔ (مروجہ محفلِ میلاد: ۵۲ ملخصاً)

عیدِ میلاد کا حکم

اس سے بعض لوگ اس غلط بات کی طرف چلے جاتے ہیں، گویا کہ ہم ذکر نبوی ﷺ کو منع کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! نفسِ ذکر میلاد فخر عالم علیہ السلام کو کوئی منع نہیں کرتا؛ بلکہ ذکرِ ولادت آپ ﷺ کا مثل ذکر دیگر سیر و حالات کے مندوب ہے۔ (البراہین القاطعۃ علی ظلام انوار الساطعۃ: ۱۴) لیکن اس زمانہ میں مجالسِ میلاد بہت سے منکرات و ممنوعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً ممنوع ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۸۱/۳ اجدید محقق) بالفاظِ دگر میلادِ مروجہ و قیام مروج جو امورِ محدثہ، ممنوعہ کو مشتمل ہے، ناجائز اور بدعت ہے۔ (عزیز الفتاویٰ: ۱۲۲، زکریا بکڈپو، دیوبند)

یومِ ولادتِ نبوی ﷺ یقیناً باعثِ خوشی اور اظہارِ مسرت کا سبب ہے؛ لیکن اس تاریخ میں ہر سال اگر یہ دن ''منانے'' کا ہوتا، تو اس کے متعلق احکامات و ہدایات شریعتِ مطہرہ میں کثرت سے وارد ہوتیں۔ یہ خیال رکھنے کی بات ہے کہ یہ دن حضور ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کے سامنے بھی تھا، تو جب خود حضور ﷺ اور صحابۂ کرامؓ نے اس خوشی کا اظہار مروجہ طریقہ پر نہیں کیا اور ''عیدِ میلاد'' نہیں منایا، تو یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شریعت میں اظہارِ خوشی کا یہ طریقہ درست نہیں، ورنہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابۂ کرامؓ اس پر عمل کر کے اس کا جواز ضرور بتلاتے۔ یہی ایک دلیل مروجہ میلاد کے غیر درست ہونے کے لیے کافی ہے۔

ارشادِ ربّانی ہے: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾۔ (سورۃ المائدۃ: ۳) آج میں نے تمھارے لیے دین کو کامل و مکمل کر دیا (اب اس میں کسی طرح کمی بیشی کی گنجائش نہ رہی) اور تم پر اپنا انعام مکمل کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر راضی ہو گیا۔

نیز ارشادِ رسول ﷺ ہے: جو ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کرے، جو دین میں سے نہیں ہے، وہ مردود ہے۔ (بخاری: ۲۶۹۷، مسلم: ۶۷۱۸)

ایک دوسری روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تم میری سنّت کو لازم پکڑو اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کی سنّت کو لازم پکڑو، اسے ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑے رہو اور دین میں نئی باتیں ایجاد کرنے سے بچو؛ کیوں کہ دین میں پیدا کی گئی ہر نئی بات بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (ابوداود: ۴۶۰۷، ترمذی: ۲۶۷۸، ابن ماجہ: ۴۲)

کیا رسول اللہ ﷺ کا بس یہی حق امت پر ہے کہ سارے سال میں صرف ایک دن اور وہ

بھی صرف تماشہ کے طور پر، آپ ﷺ کا ذکرِ مبارک جھوٹے سچے رسالوں سے پڑھ دیا اور پھر سال بھر کے لیے فارغ ہوکر آئندہ بارہ وفات اور عیدِ میلاد کے منتظر ہوکر بیٹھ گئے۔ افسوس! مسلمانوں کا فرض تو یہ ہے کہ کوئی دن آپ ﷺ کے ذکرِ مبارک سے خالی نہ جائے؛ البتہ یہ ضروری نہیں کہ فقط ولادت کا ہی ذکر ہو؛ بلکہ کبھی آپ ﷺ کی نماز کا، کبھی آپ کے روزے کا، کبھی جہاد کا، اور کبھی آپ کے اخلاق واعمال کا، جو کہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔ کبھی ولادتِ باسعادت کا بھی ہو کہ یہ بھی باعثِ خیر وبرکت ہے۔ (جواہر الفقہ: ۹۱/۴، امداد المفتین: ۱۶۳)

محبت کی علامت بھی یہی ہے کہ محبوب کی ہر بات کا ذکر ہو، ولادتِ شریفہ کا بھی، سخاوت اور عبادت کا بھی۔ اس میں کسی مہینہ اور تاریخ اور مقام کی کوئی تخصیص نہیں؛ بلکہ دوسرے وظیفوں کی طرح روزمرہ اس کا وظیفہ ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ سال بھر میں مقررہ تاریخ پر یومِ میلاد منالیا جائے اور اس کے بعد کچھ نہیں؛ حالاں کہ حضور ﷺ کا ذکرِ مبارک تو غذا ہے، ہر وقت ہونا چاہیے، اس میں وقت کی تخصیص کی کیا ضرورت؟ (الفضائل والاحکام: ۱۱۱، امداد الفتاویٰ: ۱۸۷/۱)

اس پوری تفصیل سے واضح ہوگیا کہ محفلِ میلاد میں کوئی تاریخ معین اور ضروری نہ سمجھی جائے، شیرینی کو ضروری نہ سمجھا جائے، ضرورت سے زیادہ روشنی نہ کی جائے، غلط روایات نہ پڑھی جائیں، نظم پڑھنے والے بے ریش نہ ہوں، اور گانے کی طرح نہ پڑھیں، اسی طرح دوسری بدعات سے خالی ہو، تو مضائقہ نہیں۔ (امداد الفتاویٰ: ۲۴۹/۵، ونظام الفتاویٰ، حصہ دوم: ۱۶۵/۱، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دیوبند)

غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکرِ مبارک جب کہ ان رسوم وبدعات سے خالی ہو تو ثواب اور افضل ہے، اور اگر مروجہ طریقہ پر رسوم وبدعات سے بھرا ہو تو نیکی برباد گناہ لازم ہے۔ جیسے کوئی بیت الخلاء میں جاکر قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے لگے۔ (جامع الفتاویٰ: ۵۵۲/۲، ربانی بک ڈپو، دہلی، فتاوی عثمانی: ۱۱۹/۱، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)

المختصر! ہم مسلمان ہیں اور ہمیں اپنی خوشی اور غمی، ہر حالت میں شریعت کی اتباع کرنا واجب وضروری ہے اور شریعت میں امرِ مندوب پر اصرار کرنا اور واجب کی طرح اس کا التزام کرنا اتباعِ شیطان ہے۔ (عزیز الفتاویٰ: ۱۴۲ بتغیر)

'اہلِ حدیث' علماء کا موقف

جناب مولانا مفتی ابومحمد عبدالستار صاحب فرماتے ہیں:

ہیئتِ مروجہ کے ساتھ مجلسِ میلاد کا انعقاد از روئے کتاب وسنت قطعاً حرام اور بدعت؛ بلکہ

داخل فی الشرک ہے؛ کیوں کہ اس کا ثبوت نہ تو خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، نہ کسی صحابیؓ سے، نہ کسی تابعیؒ سے۔ غرض قرونِ ثلاثہ میں اس کا وجود بالکل مفقود ہے، نہ ازمنۂ ائمہ اربعہ میں اس کا پتہ لگتا ہے؛ بلکہ ساتویں صدی میں یہ بدعت بجانب خود ایجاد کی گئی ہے۔ (فتاویٰ ستاریہ: ۱/۶۴)

جناب مولانا ثناء اللہ امرتسری فرماتے ہیں:

ہم مجلسِ میلاد کو کارِ ثواب نہیں جانتے؛ اس لیے کہ زمانۂ رسالت وخلافت میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ آگے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: مولود کی مجلس ایک مذہبی کام ہے، جس پر ثواب کی امید ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی کام پر ثواب کا بتلانا شرع شریف کا کام ہے؛ اس لیے کسی کام پر ثواب کی امید رکھنا، جس پر شرع شریف نے ثواب نہ بتلایا ہو، اس کام کو بدعت بنا دیتا ہے۔ مولود کی مجلس بھی اسی قسم سے ہے؛ کیوں کہ شریعتِ مطہرہ نے اس پر ثواب کا وعدہ نہیں کیا؛ اس لیے ثواب سمجھ کر تو یقیناً بدعت ہے، رہا محض محبت کی صورت، یہ بھی بدعت ہے؛ کیوں کہ رسول ﷺ سے محبت کرنا بھی ایک مذہبی حکم ہے، جس پر ثواب کی امید ہے۔ پس جس طریق سے شرع شریف نے محبت سکھائی ہے، اس طریق سے ہوگی تو سنّت، ورنہ بدعت۔ (فتاویٰ ثنائیہ: ۱/۱۱۹)

مفتیِ اعظم مکہ مکرمہ کا فتویٰ

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ فرماتے ہیں:

مسلمانو کے لیے ۱۲ ربیع الاول کی رات یا کسی اور رات میلاد النبی ﷺ کی محفل منعقد کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ نبی ﷺ کے علاوہ کسی اور کی ولادت کی محفل منعقد کرنا بھی جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ میلاد کی محفلوں کا تعلق ان بدعات سے ہے، جو دین میں نئی پیدا کرلی گئی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی حیاتِ پاک میں کبھی اپنی محفلِ میلاد کا انعقاد نہیں فرمایا تھا؛ حالاں کہ آپ ﷺ دین کے تمام احکام کو بلاکم وکاست، من وعن پہنچانے والے تھے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مسائلِ شریعت کو بیان فرمانے والے تھے۔ آپ ﷺ نے محفلِ میلاد نہ خود منائی اور نہ کسی کو اس کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاءِ راشدین، حضراتِ صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ میں سے کسی نے کبھی اس کا اہتمام نہیں کیا تھا، الخ۔ (مقالات وفتاویٰ: ۶/۴۰۱ اردو)

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ، وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ.

❁ ❁ ❁

نماز کی قضاء کا حکم

از: مولانا محمد نجیب قاسمی سنبھلی

علماء امت کا اتفاق ہے کہ فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اسلام میں زنا کرنے، چوری کرنے اور شراب پینے سے بھی بڑا گناہ نماز کا ترک کرنا ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ہر نماز وقت پر ادا کرنے کا اہتمام کرے اور اگر کبھی کوئی نماز وقت پر ادا نہ کر سکے تو اسے پہلی فرصت میں پڑھنی چاہیے۔ ہماری اور ہمارے علماء کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اس بات کی کوشش وفکر کریں کہ امتِ مسلمہ کا ہر ہر فرد وقت پر نماز ادا کرنے والا بن جائے اور ہماری نمازیں خشوع وخضوع کے ساتھ ادا ہوں؛ کیونکہ اسی میں ہماری اور تمام انسانوں کی اخروی کامیابی مضمر ہے؛ جیسا کہ خالق کائنات نے سورۃ المؤمنون آیات (۱-۱۱) میں بیان فرمایا ہے۔

نماز بالکلیہ نہ پڑھنے والوں یا صرف جمعہ وعیدین یا کبھی کبھی پڑھنے والوں کا قرآن وحدیث کی روشنی میں شرعی حکم کیا ہے؟ سعودی عرب کے مشہور عالم دین شیخ محمد بن صالح العثیمینؒ نے اپنی کتاب ﴿حکم تارک الصلاۃ﴾ میں فقہاء وعلماء کی مختلف آراء تحریر کی ہیں: حضرت امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ ایسا شخص کافر ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اگر توبہ کر کے نماز کی پابندی نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے۔ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ نماز کو چھوڑنے والا کافر تو نہیں؛ البتہ اس کو قتل کیا جائے گا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس کو قتل نہیں کیا جائے گا؛ البتہ حاکم وقت اس کو جیل میں ڈال دے گا اور وہ جیل ہی میں رہے گا، یہاں تک کہ توبہ کر کے نماز شروع کر دے یا پھر وہیں مر جائے۔

قرآن وحدیث میں وارد نماز کی وقت پر ادائیگی کی خصوصی تاکید کے باوجود بعض مرتبہ نماز فوت ہو جاتی ہے، کبھی بھول سے، کبھی کوئی عذر لاحق ہونے کی بنا پر اور کبھی محض لاپرواہی اور غفلت کی وجہ سے۔ حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کی روشنی میں جمہور فقہاء وعلماء ومحدثین ومفسرین کا اتفاق ہے کہ تمام فوت شدہ نمازوں کی قضا کرنی چاہیے۔ حضور اکرم ﷺ نے متعدد مرتبہ ارشاد

فرمایا کہ اگر نماز وقت پر ادا نہ کرسکیں تو بعد میں اس کو پڑھیں، اختصار کے مدنظر صحیح بخاری وصحیح مسلم میں وارد ایک حدیث ذکر کررہا ہوں: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص نماز کو بھول جائے تو جب اس کو یاد آئے فوراً پڑھ لے، اس کا سوائے اس کے کوئی کفارہ نہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے نماز قائم کرو میری یاد کے واسطے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم) بعض روایات میں اس حدیث کے الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں: جو شخص نماز کو بھول جائے یا اس کو چھوڑ کر سو جائے، اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب یاد آئے اسے پڑھے۔ حدیث کی مشہور کتاب ترمذی میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو بھی نماز کو بھول جائے یا اس سے سو جائے تو وہ جب بھی یاد آئے اس کو پڑھ لے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ تاخیر سے سونے کی عادت بنا کر فجر کی نماز کے وقت سوتے رہنا گناہ کبیرہ ہے۔ دیگر احادیث کی روشنی میں اس حدیث میں سوتے رہنے سے مراد یہ ہے کہ نماز وقت پر پڑھنے کے اسباب اختیار کیے؛ مگر کسی دن اتفاق سے آنکھ نہ کھل سکی۔

حضور اکرم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ نے بعض نمازیں وقت کے نکلنے کے بعد ادا فرمائی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ صحابۂ کرامؓ کے ساتھ غزوۂ خیبر سے واپس ہورہے تھے، رات میں چلتے چلتے جب نیند کا غلبہ ہوا تو آپ ﷺ نے رات کے اخیر حصہ میں ایک جگہ قیام فرمایا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو نگہبانی کے لیے متعین فرما کر آپ ﷺ لیٹ گئے اور صحابہ بھی سو گئے۔ جب صبح قریب ہوئی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ (تھکان کی وجہ سے) اپنی سواری سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، پس آپ پر نیند غالب ہوئی اور وہ بھی سو گئے اور سب حضرات ایسے سوئے کہ طلوعِ آفتاب تک نہ اللہ کے رسول ﷺ کی آنکھ کھلی اور نہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی، نہ کسی اور صحابی کی۔ جب سورج طلوع ہوا اور اس کی شعاعیں ان حضرات پر پڑیں تو سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے اور گھبرا کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اٹھایا۔ پھر صحابۂ کرامؓ کو آگے چلنے کا حکم دیا، صحابۂ کرامؓ اپنی سواریاں لے کر آگے بڑھے اور ایک جگہ حضور اکرم ﷺ نے وضو کیا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اقامت کہنے کا حکم دیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہی اور آپ ﷺ نے نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: جو نماز کو بھول جائے اس کو چاہیے کہ وہ یاد آنے پر اس کو پڑھ لے۔ (صحیح مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غزوۂ خندق کے دن آئے اور کفار قریش کو برا بھلا کہنے لگے اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں اب تک عصر نہ پڑھ سکا حتی کہ

سورج غروب ہونے کو ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے بھی عصر نہیں پڑھی ہے۔اللہ کے رسول ﷺ نے وضو کیا، ہم نے بھی وضو فرمایا اور پھر غروب آفتاب کے بعد آپ ﷺ نے پہلے عصر پڑھی پھر اس کے بعد مغرب ادا فرمائی۔ (صحیح بخاری) بعض احادیث میں مذکور ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ کی ایک سے زیادہ نمازیں فوت ہوئی تھیں اور آپ ﷺ نے انھیں وقت نکلنے کے بعد پڑھا۔

مذکورہ بالا احادیث سے واضح ہوا کہ اگر ایک یا ایک سے زیادہ نماز فوت ہوجائے تو فوت شدہ نمازوں کا پڑھنا لازم وضروری ہے۔تفصیلات کے لیے امام نوویؒ کی صحیح مسلم کی سب سے مشہور شرح (شرح مسلم ج۱ص ۲۷۷) اور ابن حجر عسقلانیؒ کی صحیح بخاری کی سب سے مشہور شرح (فتح الباری ج۲ص ۶۹۔۷۰) کا مطالعہ کریں۔بھول یا عذر کی وجہ سے وقت پر نماز ادا نہ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا ان شاء اللہ۔لیکن اگر کوئی شخص جان بوجھ کر نماز کو ترک کردے تو یہ بڑا گناہ ہے، اس کے لیے توبہ ضروری ہے۔توبہ کے ساتھ جمہور علماء کی رائے ہے کہ اس کو نماز کی قضا بھی کرنی ہوگی۔حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کی روشنی میں یہی رائے ہے کہ قصداً وعمداً نماز چھوڑنے پر بھی نماز کی قضاء کرنی ہوگی۔شیخ ابوبکر الزرعی (۶۹۱ھ۔۷۵۱ھ) نے اپنی کتاب (الصلاۃ وحکم تارکھا) میں تحریر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے کہا کہ اس شخص پر بھی نماز کی قضا واجب ہے جو قصداً نماز کو چھوڑ دے؛ مگر قضاء سے نماز چھوڑنے کا گناہ ختم نہ ہوگا؛ بلکہ اسے نماز کی قضاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگنی ہوگی۔علامہ قرطبیؒ (متوفی ۶۷۱ھ) نے اپنی مشہور ومعروف تفسیر (الجامع لاحکام القرآن ج۱ص ۱۷۸) میں یہی تحریر کیا ہے کہ جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے شخص پر قضاء واجب ہے، اگرچہ وہ گناہ گار بھی ہے۔علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے پر قضاء واجب ہے۔ غرضیکہ اگر کسی شخص کی ایک یا متعدد نمازیں قصداً چھوٹ جائیں تو اللہ تعالیٰ سے معافی کے ساتھ فوت شدہ نمازوں کی قضاء کرنی ضروری ہے؛ کیونکہ جمہور علماء حتی کہ چاروں ائمہ نے حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کی روشنی میں یہی کہا ہے، صرف زمانۂ قدیم میں جناب داؤد ظاہری اور موجودہ زمانہ میں اہلِ حدیث حضرات نے اختلاف کیا ہے۔اور جن بعض علماء نے نماز کے جان بوجھ کر ترک کرنے پر نماز کی قضاء کے واجب نہ ہونے کا جو فیصلہ فرمایا ہے وہ اصل میں اس بنیاد پر ہے کہ ان کے نقطۂ نظر میں جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والا شخص کافر ہوجاتا ہے۔اب جب کافر ہوگیا

تو نماز کی قضاء کا معاملہ ہی نہیں رہا؛ لیکن جمہور علماء کی رائے ہے کہ جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والا شخص کافر نہیں؛ بلکہ فاسق یعنی گناہ گار ہے اور یہی قول زیادہ صحیح ہے ورنہ عصر حاضر میں امت مسلمہ کی ایک بڑی تعداد دائرۂ اسلام سے خارج ہوجائے گی۔

صحیح مسلم کی سب سے مشہور شرح لکھنے والے اور ریاض الصالحین کے مصنف امام نوویؒ نے شرح مسلم میں تحریر کیا ہے کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص نماز کو عمداً ترک کردے اس پر قضاء لازم ہے۔ بعض علماء نے مخالفت کی ہے؛ مگر بعض علماء کی یہ رائے اجماع کے خلاف ہونے کے ساتھ دلیل کے لحاظ سے بھی باطل ہے۔ نیز انھوں نے تحریر کیا ہے کہ بعض اہل ظاہر سب سے الگ ہوگئے اور کہا کہ بلاعذر چھوٹی ہوئی نماز کی قضاء واجب نہیں، اور انہوں نے یہ خیال وگمان کیا کہ نماز کا چھوڑنا اس سے بڑا گناہ ہے کہ قضاء کرنے کی وجہ سے اس کے وبال سے نکل جائے؛ مگر یہ قول کے قائل کی غلطی وجہالت ہے۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۲۳۸)

علامہ عبدالحئ حنفی لکھنویؒ (جنہوں نے صرف ۴۰ سال کی عمر پائی اور تقریباً ۸۰ کتابیں تحریر فرمائیں، جن کی علمی صلاحیتوں کو تمام مکاتبِ فکر نے تسلیم کیا ہے) تحریر کرتے ہیں کہ بعض اہل ظاہر سب سے الگ ہوگئے اور کہا کہ اپنے وقت میں نماز کو جان بوجھ کر چھوڑنے والے پر ضروری نہیں کہ دوسرے وقت میں اس کو ادا کرے۔ (التعلیق الممجد علی مؤطا للامام محمد ص ۱۲۷)۔

غور فرمائیں کہ جب حضور اکرم ﷺ نے بھولنے والے یا سونے والے پر بھی فوت شدہ نماز کی قضاء کو لازم کیا ہے؛ حالانکہ یہ دونوں گناہ گار نہیں ہیں تو جان بوجھ کر قضاء کرنے والے پر بدرجۂ اولیٰ نماز قضاء ہونی چاہیے۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ (اپنے والدین کو اف نہ کہو) تو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب والدین کو (اف) کہنا بھی جائز نہیں تو ان کو مارنا پیٹنا یا گالی دینا اور بھی برا اور سخت گناہ ہوگا۔ اسی طرح جب بھولنے اور سوجانے پر قضاء لازم کی گئی تو عمداً ترک نماز پر قضاء اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے یا ایک عورت نے اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ میری ماں کا انتقال ہوگیا اور اس پر ایک ماہ کے روزے رہ گئے ہیں تو کیا میں ان کی قضاء کروں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تو اس کو ادا کرتا؟ اس نے کہا کہ ہاں میں ادا کرتا۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کا قرض زیادہ مستحق ہے کہ اس کی ادائیگی کی جائے۔ حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد روزوں کی قضاء کے بارے میں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ روزہ اور نماز میں فرض ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں؛ بلکہ قرآن وحدیث میں نماز پڑھنے کی تاکید سب

سے زیادہ وارد ہوئی ہے۔ لہٰذا جب روزے کی قضاء ہے تو نماز کی بھی قضاء ہونی چاہیے۔

نیز پوری امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر رمضان کا روزہ ترک کردے تو اس کی قضاء ضروری ہے، اسی طرح اگر کسی شخص نے استطاعت کے باوجود حج ادا نہیں کیا تو اس کے مرنے پر اس کے وارثین پر لازم ہے کہ وراثت کی تقسیم سے قبل اس کے ترکہ میں سے حج بدل کا انتظام کرے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے قصداً متعدد سالوں سے زکوٰۃ ادا نہیں کی اور اب اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے تو اسے گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ۱۴۰۰ سال سے جمہور فقہاء وعلماء ومحدثین ومفسرین کی یہی رائے ہے کہ نماز کے فوت ہونے پر اس کی قضاء کرنی ضروری ہے خواہ بھول جانے یا سوجانے کی وجہ سے نماز فوت ہوئی ہو، یا جان بوجھ کر نماز چھوڑی گئی ہو، ایک نماز فوت ہوئی ہو یا ایک سے زیادہ۔ مشہور ومعروف چاروں ائمہ کی بھی حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کی روشنی میں یہی رائے ہے۔ بھول جانے یا سوجانے کی صورت میں گناہ گار نہیں ہوگا؛ مگر قضاء کرنی ہوگی اور قصداً نماز ترک کرنے پر نماز کی قضاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی ہوگی۔

جن علماء نے فرمایا ہے کہ قصداً نماز ترک کرنے والا کافر ہوجاتا ہے، جیسا کہ سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن بازؒ کا موقف ہے، تو ان کا یہ قول کہ جان بوجھ کر چھوڑی گئی نماز کی قضاء نہیں ہے، کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے، اگرچہ قصداً نماز چھوڑنے والے پر کافر ہونے کا فتویٰ لگانا جمہور علماء کے قول کے خلاف ہے؛ مگر وہ حضرات جو جمہور علماء کے قول کے مطابق تارک صلاۃ پر کافر ہونے کا فتویٰ تو صادر نہیں فرماتے؛ مگر قصداً نماز ترک کرنے پر نماز کی قضاء کے ضروری نہ ہونے کا فیصلہ فرماتے ہیں تو ان کی یہ رائے جمہور علماء کے قول کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ غیر منطقی اور دلائل کے اعتبار سے باطل بھی ہے، جیسا کہ مشہور ومعروف محدث امام نوویؒ نے تحریر کیا ہے۔ نیز احتیاط کا تقاضی بھی یہی ہے کہ فرض نماز کی قضاء کو واجب قرار دیا جائے؛ تاکہ کل آخرت میں کسی طرح کی کوئی ذلت اٹھانی نہ پڑے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن آدمی کے اعمال میں سب سے پہلے فرض نماز کا حساب لیا جائے گا۔ اگر نماز درست ہوئی تو وہ کامیاب وکامران ہوگا، اور اگر نماز درست نہ ہوئی تو وہ ناکام اور خسارہ میں ہوگا۔ (ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، ابوداؤد، مسند احمد)

جب ہم نے یہ تسلیم کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے نماز فرض کی ہے اور قصداً نماز چھوڑنے والا کافر نہیں؛ بلکہ فاسق وفاجر ہے تو قصداً نماز چھوڑنے پر قضاء کے واجب نہ قرار دینے کی بات

سمجھ میں نہیں آتی۔ مثلاً اگر کسی شخص نے زنا کیا یا چوری کی تو اسے اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگنی ہوگی اور اگر اس کا جرم شرعی عدالت میں ثابت ہوجاتا ہے تو اس پر حد بھی جاری ہوگی۔ یعنی اسے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کے ساتھ دنیاوی سزا بھی بھگتنی ہوگی۔ اسی طرح قصداً نماز چھوڑنے والے کو اللہ تبارک وتعالیٰ سے معافی مانگنے کے ساتھ نماز کی قضاء بھی کرنی ہوگی۔

غرضیکہ حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ ہر نماز کو وقت پر ادا کرنا چاہیے، ہاں خدانخواستہ اگر کوئی نماز چھوٹ جائے تو پہلی فرصت میں اس کی قضاء کرنی چاہیے خواہ بھول کی وجہ سے یا سونے کی وجہ سے یا کسی عذر کی وجہ سے نماز فوت ہوئی ہو یا محض لاپرواہی اور غفلت کی وجہ سے نماز ترک ہوئی ہو، ایک نماز فوت ہوئی ہو یا ایک سے زیادہ یا چند سالوں کی۔ حضور اکرم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں یہ تصور بھی نہیں تھا کہ کوئی مسلمان جان بوجھ کر کئی دنوں تک نماز نہ پڑھے۔ خیر القرون میں ایک واقعہ بھی قصداً چند ایام نماز ترک کرنے کا پیش نہیں آیا؛ بلکہ اس زمانہ میں تو منافقین کو بھی نماز چھوڑنے کی ہمت نہیں تھی۔ اگر لاپرواہی اور غفلت کی وجہ سے نمازیں ترک ہوئی ہیں تو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے اور توبہ واستغفار کا سلسلہ موت تک جاری رکھ کر فوت شدہ نمازوں کی قضاء کرنی چاہیے خواہ وہ فوت شدہ نمازوں کو ایک وقت میں ادا کرے یا اپنی سہولت کے اعتبار سے ہر نماز کے ساتھ قضاء کرتا رہے۔ علماء کرام نے تحریر کیا ہے کہ ایسے شخص کے لیے بہتر ہے کہ وہ نوافل کا اہتمام نہ کرکے فوت شدہ نمازوں کی قضاء کرے۔ یہی ۱۴۰۰ سالوں سے جمہور فقہاء وعلماء ومحدثین ومفسرین کی حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کی روشنی میں رائے ہے اور عصر حاضر میں مشرق سے مغرب تک اکثر وبیشتر علماء کرام کی یہی رائے ہے اور یہی قول احتیاط پر مبنی ہے کہ نمازوں کو چھوڑنے کا سخت گناہ ہے حتی کہ علماء کرام نے فرمایا ہے کہ زنا کرنے، چوری کرنے اور شراب پینے سے بھی بڑا گناہ نماز کا ترک کرنا ہے۔ لہٰذا فوت شدہ نمازوں پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کے ساتھ ان کی قضاء بھی کرنی چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں نمازوں کو ان کے اوقات میں پڑھنے والا بنائے اور ایک وقت کی نماز بھی ہماری فوت نہ ہو!

❁ ❁ ❁

یہ خیر خواہی نہیں، قتل ہے

از: مفتی محمد فیاض قاسمی
رہوا، رامپور، وارث نگر سمستی پور

ڈاکٹروں کی تحقیق اور علمی حلقوں میں یہ بات زیر بحث چلتی چلی آرہی ہے کہ اگر کوئی شخص پیدائشی طور پر لاعلاج بیماری میں مبتلا ہے یا عمر کے کسی بھی اسٹیج پر وہ مہلک مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اس کی حالت ایک زندہ نعش کی ہوجاتی ہے کہ وہ خود سے اپنی کوئی بھی ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔ سارا کام اس کے قریبی رشتہ داروں کی مدد سے انجام پاتا ہے۔ تکلیف بھی اتنی شدید کہ مریض ہر وقت آہ وبکا کرتا رہتا ہے۔ اسے موت آتی ہے اور نہ ہی شفا نصیب ہوتی ہے۔ اس کی تکلیف اس کے رشتہ داروں سے دیکھی نہیں جاتی اور اس کی وجہ سے اس کے احباب ہر وقت پریشان رہتے ہیں۔ بعض مریضوں کو تو مرض کی شدت کم کرنے کے لیے دواؤں اور دیگر جدید مشینوں کی مدد سے مستقل طور پر بے ہوشی میں رکھا جاتا ہے؛ تاکہ اس کی تکلیف میں مزید اضافہ نہ ہو۔ اس طرح کی صورت حال میں مریض یا اس کے رشتہ دار یہ چاہتے ہیں کہ ایسے میں مریض کا زندہ رہنا نہ رہنے کے برابر ہے، تو پھر کیوں نہ اسے مناسب تدابیر کے ذریعہ موت کے آغوش میں پہنچا دیا جائے؛ تاکہ جہاں مریض کو ناقابلِ برداشت تکالیف سے نجات مل جائے گی وہیں، اس کے رشتہ داروں کو بھی پریشانیوں سے چھٹکارا مل جائے گا، جو مریض کی دیکھ بھال اور اس کی خدمت کی وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ اسی عمل کو موت بجذبۂ شفقت یعنی یوتھینز یا (Euthanasia) کہا جاتا ہے، تھوڑی سی تمہید وتعارف کے بعد اس کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اللہ پاک نے اپنی تمام تر مخلوقات میں سب سے افضل انسان کو بنایا اور اسے اکرام سے بھی نوازا، ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي اٰدَمَ''۔ انسان کی خلقت اور تکریم کے ساتھ ساتھ اللہ نے مقصد کی تعیین بھی کردی کہ انسان اور جنات کی تخلیق ہم نے اپنی عبادت کے لیے کی ہے، فرمایا ''وَمَا خَلَقْتُ

الجِنَّ والِانسَ اِلاّلِيَعبُدُونِ“۔

تحسین خلقت، تعیین مقصد اور تکریم اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کا پاس ولحاظ ہمہ وقت رکھا جائے، تبھی بندگی بندگی کہلائے گی۔ اگر اس کے خلاف کوئی ایسی راہ اختیار کی جائے جس میں مذکورہ امور کی پامالی ہو، تو پھر گویا خالق کی خلقت میں تصرف کرنا ہے، جو کہ سراسر ظلم ہے۔

یوتھینز یا یعنی مہلک اور تکلیف دہ مرض کو جھیل رہے مریض پر رحم کرتے ہوئے اسے مصیبت سے نجات دلانے کے لیے موت کی نیند سُلا دینا دو نوعیت کا ہوسکتا ہے: عملی اور غیر عملی۔

(۱) پہلی صورت عملی: جس میں مریض کو کسی دوا وغیرہ کے ذریعہ موت کے گھاٹ اتار دینا ہے۔ اس کی حیثیت اسلام میں قتل کی ہے اور شریعت مطہرہ اس کی اجات نہیں دیتی۔ اللہ پاک نے فرمایا: ”لا تَقتُلُوا النَّفسَ الَّتِی حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالحَقِّ“ (سورہ انعام آیت ۱۵۱) یعنی کسی بھی جان کو ناحق قتل کرنے کی اجازت نہیں۔ حدیث پاک میں وضاحت ہے کہ قتل کا جواز صرف تین وجوہ سے ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ قتل کرنا حرام ہے۔ ”لا یَحِلُّ دَمُ اِمرِئٍ مسلمٍ اِلّا بِاِحدَیٰ ثَلاثٍ، کُفرٌ بَعدَ الإیمانِ، وَزِناً بعدَ الإحصانِ، قتلُ نفسٍ بغیرِ حقٍ“ (تفسیر کبیر ج ۱۳، ۱۴/ ص ۲۳۳) یعنی کسی کا خون حلال ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگیا ہو؛ شادی شدہ تھا پھر زنا کیا ہو؛ یا کسی نے ناحق کسی کو قتل کر دیا ہو۔ صرف ان ہی تینوں صورتوں میں اس طرح کے مجرم کو قتل کرنا جائز ہے۔ ان کے علاوہ کسی کی جان لینے کے جو بھی حربے اختیار کیے جائیں، وہ ناحق اور ناجائز ہوں گے۔

نیز انسان کو اللہ پاک نے پیدا کیا ہے؛ لہٰذا انسان اللہ کے ہاتھ کی تعمیر شدہ عمارت ہے اور اللہ کی عمارت گرانے اور ڈھانے والا ملعون ہے۔ ”اَلاٰدمِیُ بُنیانُ الرَّبِ مَلعونٌ مَن هَدَمَ بنیانَ الربِ“ الحدیث (تفسیر کبیر ج ۱۹، ۲۰ ص ۲۰۰)۔ یعنی خالق کی خلقت میں تصرف کرنا لعنت کا باعث ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ اسی طرح بندہ پر اللہ کا حق ہے اور وہ حق یہ ہے کہ بندہ اس کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ ”قال علیه السلام: حَقُّ اللّٰهِ عَلَیَ العِبادِ اَنْ یَعبُدُوهُ وَلا یُشرِکُوا بِه شَیئًا“ (تفسیر کبیر ج ۱۹، ۲۰ ص ۲۰۰) اب اگر کسی کو ناحق موت تک پہنچا دیا جائے تو گویا اس نے اللہ کا حق جو اس بندے پر تھا، اس کو چھین لیا اور اس کی عبادت سے اسے محروم رکھا۔ مریض اگرچہ حالت مرض میں ہے تب بھی وہ اللہ کے حق (عبادت) کو کسی نہ

کسی حیثیت سے پورا کر رہا ہے؛ لہٰذا اس کو موت آنے سے پہلے عملی طور پر موت کی نیند سلا دینا اللہ کے حق کی حق تلفی ہوگی۔

فتاوی شرعیہ میں ایک سوال ہے: ''کیا ایسا مریض جو اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا ہو تو اس کو عملی طریقہ سے موت تک پہنچانا جائز ہے''؟ اس کے جواب میں لکھا ہے کہ کسی بھی ذریعہ سے مریض کو قتل کرنا حرام قطعی ہے اور ایسا کرنے والا قاتل اور جو شخص ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے یا اس پر آمادہ کرتا ہے وہ بھی اس گناہ عظیم میں شریک ہوگا۔ (الفتاوی الشرعیہ، ج ۴ص ۴۵۱ باب التداوی)

مریض گرچہ طویل عرصہ سے مرض کو جھیل رہا ہے جو اس کے لیے سخت تکلیف کا باعث ہے؛ لیکن ایسی حالت میں زندہ رہنا بھی اس کے لیے فائدہ سے خالی نہیں ہے؛ کیوں کہ مسلمان کو جب بھی کوئی تکلیف، غم، مصیبت اور اذیت پہنچتی ہے حتی کہ اگر اسے کانٹا بھی چبھ جاتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ پاک اس کے گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ گویا بیماری میں مبتلا ہونا بھی مغفرت الٰہی کا ذریعہ ہے، لہٰذا مریض کی مغفرت کی راہ مسدود نہ کی جائے۔ "عَن اَبِی سَعِیدٍ عَنِ النبیِ صلی اللّٰہِ علیہ وسلم قال مَا یُصِیبُ المسلمَ مِن نَصبٍ ولا وَصَبٍ ولا وَلَاھَمٍّ ولا حُزنٍ ولا اَذیً وَلا غَمٍّ حَتٰی الشَوکَۃَ یُشاکُھا اِلّا کَفَّرَ اللّٰہُ بِھا مِنْ خَطَایَاہُ" متفق علیہ (مشکوۃ ج۱، ص۱۳۴) ایک دوسری روایت میں ہے "مامِن مُسلمٍ یُصِیبُہ اَذی مِنْ مَرضٍ فَما سِواہُ اِلّا حَطَّ اللّٰہُ بِہ سَیِّئاتِہ کَما تُحُطُ الشَجرۃُ وَرَقَھا (مشکوۃ ۱۳۴)

نیز فقہاء کے اصول سے بھی ایسے عمل کی اجازت نہیں ملتی ہے۔ "اِذا تَعارضَ دلیلُ تَحریمِ القَتلِ ودلیلُ اِباحَتِہ فَقَدُ اَجمَعُوا علٰی اَنّ جانِبَ الحُرمۃِ راجحٌ" یعنی جب کسی کے قتل کے حرام اور حلال ہونے کی دلیل متعارض ہوجائے تو ایسی صورت میں جانبِ حرمت کو ترجیح ہوگی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یوتھینیزیا کے مریض کو اس کی گرانبار زندگی سے اور اس کے اعزا واقربا کو اس کی طویل پریشانیوں سے نجات دلانے کے لیے ایسے مریض کو موت تک پہنچا دینا مناسب اور مباح معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اسبابِ قتل میں سے کسی سبب کے نہ پائے جانے کی وجہ سے قتل کی حرمت بھی معلوم ہوتی ہے، لہٰذا ایسے تعارض کے وقت حرمت کی دلیل کو راجح قرار دے کر حرمت کا حکم لگایا جائے گا اور اسے موت تک پہنچا دینے والے اسباب کے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

(۲) دوسری صورت (غیر عملی): جس میں مریض کو موت تک پہنچانے کے لیے اس کے مرض کے علاج کو ترک کردیا جائے؛ تاکہ وہ خود ہی مرجائے؛ یہ حربہ بھی جائز نہیں۔ اللہ پاک نے جب بیماری پیدا کی ہے تو اس کے علاج کی صورتیں بھی پیدا فرمائی ہیں۔ ہر مرض کا علاج موجود ہے۔ ضرورت ہے تلاش اور صحیح تشخیص کی۔ ''عَن اَبِی الدَّرْدَاءِ قال، قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اِنَّ اللّٰہ اَنزلَ الدَاءَ والدَواءَ، جَعلَ لِکُلِ داءٍ دواءً فَتَدَاوَوْا، ولاتَدَاوَوْا بِحرامٍ'' (رواہ ابوداؤد، شرح الطیبی ج۹ ص۲۹۶۳)

یعنی یہ گمان رکھنا کہ فلاں بیماری جو مریض کو لاحق ہے، اس کا علاج ممکن نہیں اور اس کے لیے کوئی دوا یا شفا کی چیز تیار نہیں کی گئی، یہ خیال فاسد ہے اور حدیث کے خلاف ہے۔ شریعت مطہرہ اس کے پیش نظر علاج کرانے کی ترغیب دیتی ہے۔ فقہا و محدثین نے علاج کرانے کو مستحب قرار دیا ہے؛ کیوں کہ خود آپ ﷺ نے علاج کرایا ہے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ سے لوگوں نے دریافت کیا: یا رسولَ اللہ! کیا ہم علاج نہ کرائیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا؛ کیوں نہیں، اللہ کے بندو! علاج کراؤ؛ کیوں کہ اللہ پاک نے کوئی بیماری ایسی نہیں پیدا کی جس کے لیے شفا نہ ہو۔ یعنی ہر مرض کی دوا موجود ہے۔ ''عن اُسامۃَ بنِ شریکٍ قال، قالوا: یا رسول اللّٰہ، اَفَنَتَدَاوٰی؟ قال نَعَمْ، یاعَبدَاللّٰہِ تَداوَوا، فاِن اللّٰہ لَمْ یَضعْ داءً اِلّا وَضعَ لہ شِفاءً، غَیرَ داءٍ واحدٍ، اَلھَرمِ۔ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد (شرح الطیبی ج۹/۲۹۶۲)

یہ حقیقت ہے کہ دوا فی نفسہٖ شافی نہیں؛ بلکہ شفا دینے والا خالق حقیقی اللہ ہے؛ لیکن دنیا دارالاسباب ہے؛ اس لیے اسباب اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی توکل کے پیش نظر علاج کرانا ترک کردیتا ہے تو یہ بھی جاننا چاہیے کہ توکل کے کئی درجات ہیں، ان میں کون سا توکل معتبر ہوگا۔ لہٰذا اگر کوئی توکل کرکے زہر پی لے یا پہاڑ سے کود جائے یا ٹرین کے نیچے آجائے تو ایسا توکل نص قطعی کے خلاف ہوگا۔ اللہ نے فرمایا: لاتُلقُوا بِاَیدِیکم اِلی التَھلُکَۃِ۔

نیز ضرر کو زائل کرنے والے اسباب کی تین قسمیں ہیں: یقینی، ظنی، وہمی۔ کوئی مرض ایسا لاحق ہوجائے کہ ترک علاج کی وجہ سے اس مریض کا ہلاک ہونا یقینی ہو، تو ایسی صورت میں توکل کی وجہ سے یا روپے پیسے خرچ ہونے کے خوف سے یا اقربا کی پریشانی کے باعث مریض کے علاج کو چھوڑ دینا جو موت تک پہنچانے والا ہو، جائز نہیں۔ ''اِن الاَسبابَ المُزِیلۃَ لِلضَررِ

تَنقَسمُ الی مقطوعٍ بِه کالماءِ المُزیلِ لِضَررِالعطشِ والخُبزِ المزیلِ لضرر الجُوعِ ....الخ اَما المَقطوعُ بِه فَلَیسَ تَرُکُه مِنَ التَوَکُّلِ بَلُ تَرکُه حَرامٌ عِندَ خَوفِ المَوتِ (اوجزالمسالک ج۶ رص۳۱۱)

گوعلاج کرانا واجب نہیں؛لیکن مریض کو یوں ہی بلاعلاج کے یا علاج موقوف کر کے چھوڑ دینا کہ وہ موت کے منہ میں چلا جائے، یہ بھی تو انسانی حمیت اور تکریم کے خلاف ہے۔ ایسی صورت میں انسان ایک بے قیمت سامان کی مانند ہوجائے گا اوراس کی کوئی اہمیت،کوئی مقام اور قدر باقی نہیں رہے گا، جوکہ اللہ کی مشیت اور تخلیق کے منافی ہے۔ ہرکسی کی جان سستی ہوجائے گی۔ وہ سمجھے گا کہ اسے مرنا ہی ہےاورمرنے دیا جائے؛ غرض ایسا عمل رسول اللہ ﷺ کی تعلیم (عیادت) اوراسلام کی روح مسخ کرنے کے مترادف ہوگا؛ کیوں کہ اسلام نے ہمیں ہمدردی، غمگساری،اخوت ومحبت اور ''مَنْ کَانَ فِی حَاجةِ اَخِیهِ کان اللّٰهُ فی حاجتِه وَمَن فَرجَ عَن مسلمٍ کُربةً فرج اللّٰه عنه کربةً مِن کُرَبِ یَومَ القِیامةِ'' کا درس دیا ہے۔لہٰذا ایسے خلاف شرع مقاصد کے لیے ترک معالجہ کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

❁ ❁ ❁

خواتین کی تعلیم وتربیت

از: مفتی محمد تبریز عالم قاسمی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد

انسان جب زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوتا ہے تو واقعی وہ انسان ہوتا ہے، ہر زمانے میں تعلیم یافتہ حضرات کی قدر و قیمت رہی ہے؛ تعلیم کے بغیر ترقی وعروج کی خواہش، بے بنیاد خواہش ہے، انسان کی نافعیت کے لیے، دینی تعلیم، اسلامی تربیت، ایمانی شائستگی اور انسانی عادات وآداب کی اتنی ہی ضرورت ہے، جتنی ضرورت مچھلی کے لیے پانی کی ہے، تعلیم وہ نسخۂ کیمیا ہے، جس سے مُردوں کی مسیحائی عمل میں آسکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ احادیث میں دینی تعلیم کے حصول کی افادیت واہمیت کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

خداوند قدوس نے دنیا کو آباد رکھنے کے لیے حضرت آدمؑ کے ساتھ حضرت حواؑ کو بھی پیدا فرمایا اور پھر ان دونوں سے نسل انسانی کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک تناسب سے مرد وخواتین کی تخلیق ہوتی رہی، مکلّف بن جانے کے بعد دونوں کی ذمہ داریاں الگ الگ طے کردی گئیں، مردوں کو بطورِ خاص خارجی معاملات کا نگراں بنایا گیا؛ جب کہ عورتوں کو اندرونِ خانہ معاملات کا ذمہ دار بنایا گیا اور اسے تاکید کی گئی کہ اس کی عزت وآبرو اور اخروی فلاح وبہبود، چراغِ خانہ بنے رہنے میں مضمر ہے اور اس کا شمعِ محفل بننا اسلام کو پسند نہیں؛ اسی لیے خالقِ کائنات نے عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات ان سب کا مکلّف جیسے مردوں کا بنایا ہے، ویسے ہی عورتوں کو بھی اس کا مخاطب بنایا ہے، اسی لیے علم کا حصول دونوں ہی صنفوں پر فرض قرار دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ علم کے جو ذرائع ہیں یعنی انسان کی ظاہری حواس، عقل وفہم اور دوسرے انسانوں سے استفادہ کی صلاحیت، مردوں میں بھی پائی جاتی ہیں اور عورتوں میں بھی۔

جہاں اس امر کا انکار اسلامی نقطۂ نظر سے ناممکنات میں سے ہے کہ مردوں کے لیے اتنا علم

اوراتنی دینی تعلیمات بےحدضروری ہے، جن سےوہ دین پرصحیح طورسےعمل پیراہوسکیں اورشریعت کےمطالبات کوروبہ عمل لاکرنگاہِ شریعت میں معتبربن سکیں، وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ عورتوں کے لیے دینی تعلیم وتربیت سے آگاہ ہونااوردینی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونا، آئندہ کی دائمی حیات کے لیے ناگزیرہے، اوراسی دینی تعلیم وتربیت کوروبہ عمل لاکرکےایک عام قومی بیداری اوراجتماعی شعورکوترقی دینے کا خواب شرمندۂ تعبیرہوسکتا ہےاور چوں کہ عورت کے کئی رنگ ہیں، کبھی وہ رحمت کی شکل میں بیٹی کا روپ لیے ہوتی ہے، تو کبھی پیاری بہن، کبھی کسی کی شریک حیات ہوتی ہے، تو کبھی ماں کی شکل میں شجرسایہ دار؛ اس لیے اس کی ذمہ داری کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی ہےاور اس کے لیے زیورِتعلیم کی قیمت، سونے چاندی سے بھی بڑھ جاتی ہے؛ چوں کہ اسلام سےقبل عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی؛ اس لیے آپ نے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص توجہ دلائی، آپ کا ارشاد ہے: جوشخص اپنی بیٹی کی خوب اچھی طرح تعلیم وتربیت کرے اوراس پردل کھول کرخرچ کرے تو (بیٹی) اس کے لیے جہنم سے نجات کا ذریعہ ہوگی (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۰۴۴۷)، امام بخاری نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں ایک پوراباب ہی قائم کیا ہے باب عظة الإمام، النساء وتعليمهنّ، حضورعلیہ الصلاۃ والسلام جیسے صحابۂ کرامؓ کو پند ونصیحت کیا کرتے تھےویسے ہی صحابیات کے درمیان بھی تبلیغ دین فرمایا کرتے تھے۔

ایک بیٹی، رحمت اسی وقت بن سکتی ہے، جب کہ اس کا قلب اسلامی تعلیمات کی روشنی سے منور ہو، وہ فاطمی کردارو گفتار کا پیکر ہو، ایک عورت، مرد کے لیے شریکِ حیات کی شکل میں، روحِ حیات اور تسکینِ خاطر کا سبب اسی وقت بن سکتی ہے، جب کہ اس کا دل سیرتِ خدیجہؓ سے سرشار ہو، وہ ایک مشفق اور ہردردکا درماں، مصائب کی گرم ہواؤں میں، نسیم صبح کی صورت میں ''ماں'' اسی وقت ثابت ہوسکتی ہے؛ جب کہ اس کی گود بچے کے لیے پہلا اسلامی مکتب ثابت ہو، وہ بھائیوں کی محبتوں کا مرکز وملجا اسی وقت ہوسکتی ہے، جب کہ اس کے جذبات واحساسات، ویسے ہوجائیں، جیسے حضرت عائشہؓ کے جذبات، اپنے بھائی حضرت عبدالرحمٰن کی وفات کے بعدامت کے سامنے آئے۔

اسلامی زندگی کے سفرمیں نام نہاد مغربی تعلیم وتہذیب کے دھوکہ دینے والے چراغ کافی نہیں ہیں؛ بلکہ اس سفرکی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے اسلامی تعلیمات کے روشن ستاروں سے نسبت رکھنا بےحدضروری ہے، مغربی تہذیب کے چراغ کسی بھی وقت بجھ سکتے ہیں؛ لیکن اسلامی تعلیمات کے ستاروں کی ضیاپاشی اورتابندگی کی بقاءِحیات ایک زندہ جاوید حقیقت ہے۔

عصر حاضر اور ہماری کوتاہیاں

لیکن آج تعلیم گاہوں اور دینی تعلیمات کے متعدد ذرائع کے موجود ہونے کے باوجود، دینی تعلیم سے بے رغبتی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، جس مذہب نے دینی تعلیم کو تمام مردوں عورتوں کے لیے فرض قرار دیا ہو اور جس مذہب میں علم وحکمت سے پُر قرآن جیسی عظیم کتاب ہو اور جس مذہب کی شروعات ہی "اقرأ" یعنی تعلیم سے ہوتی ہو، اسی مذہب کے ماننے والے دینی تعلیم کے میدان میں سب سے پیچھے ہیں اور اگر بات عورتوں کی مذہبی تعلیم کی، کی جائے (نہ کہ محض عصری ومغربی تعلیم کی) تو معاملہ حد سے تجاوز ہوتا ہوا نظر آتا ہے، کہتے ہیں کہ ماں کی گود بچوں کے لیے پہلا مکتب ہوتا ہے، اب اگر ماں ہی دینی تعلیم سے بیزار ہو تو اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ بچے پر کیا اثرات پڑیں گے، آج خواتین کو قرآن وحدیث کے مطالعہ کی فرصت نہیں؛ نتیجتاً وہ اپنے بچوں کے لیے بھی اس حوالے سے متفکر نہیں ہوتیں، عورتوں کا بہت بڑا طبقہ ایسا ملے گا، جسے سیرتِ رسول ﷺ کی موٹی موٹی باتیں معلوم نہیں، طہارت وعبادت بالخصوص نماز کی بجا آوری تو دور کی بات، ان کے مسائل سے تشویش ناک حد تک ناواقفیت ہے، حقوقِ والدین، حقوقِ زوج اور دیگر چھوٹے بڑے افرادِ خانہ کے حقوق سے غفلت روز افزوں ہے، نوبت بایں جارسید کہ ٹھوس اسلامی تعلیمات سے دوری نے مسلم خواتین کو یہ منفی سبق پڑھایا کہ پردہ، آزادیِ نسواں کے لیے سدِّ راہ ہے اور نام نہاد ترقی کا دشمن ہے اور اس کا چراغِ خانہ ہونا قدامت پسندی ہے، اسے جدیدیت کا لبادہ اوڑھ کر شمعِ محفل بن جانا چاہیے، مضبوط دینی تعلیمات سے لاعلمی نے ساس بہو کے جھگڑے پیدا کردیے، دینی تعلیمات سے اجتناب نے طلاق کی شرح میں اضافہ کردیا، دینی تعلیمات سے بے گانگی نے بڑے بوڑھوں کی خدمت کو کارِ ثواب کے بجائے کارِ زحمت بنادیا، بقدرِ ضرورت دینی تعلیمات سے بُعد اور مغربی تعلیمات سے قرب نے مسلمان خواتین کو امورِ خانہ داری انجام دینے کے بجائے، آفس، ہوٹلوں اور ہسپتالوں میں (Reception) رسپشن کی زینت بنادیا، دینی تعلیمات سے صرفِ نظری نے پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی کے بدلے، لڑائی جھگڑے کے طور طریقے سکھلادیے۔ الغرض اسلامی زندگی کے جس موڑ پر آپ اسلامی روح کو تڑپتے ہوئے دیکھیں گے، اس کا نتیجہ دینی تعلیمات کا زندگی میں، نہ ہونا پائیں گے، علامہ اقبالؒ نے کہا تھا ''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ'' اس سے کیسا وجود مراد ہے، کیا اسلامی اور دینی تعلیمات کی روح سے یکسر خالی

مغربی وجودِ زن؟ آج ہر طرف عصری اور مغربی علوم کا غلغلہ ہے، اسلام اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتا؛ ہاں! مگر اتنی بات ضرور ہے کہ دینی تعلیم کو فراموش کر کے، عصری تعلیم میں بالکلیہ لگ جانا، اسلام کو پسند نہیں، اسلام اسے قابل اصلاح سمجھتا ہے۔

آج دینی تعلیم کی ضرورت جتنی مردوں کو ہے، اس سے کہیں زیادہ عورتوں کو ہے، عورت کا قلب اگر دینی تعلیمات سے منور ہو، تو اس چراغ سے کئی چراغ روشن ہوسکتے ہیں، وہ دیندار بیوی ثابت ہوسکتی ہے، وہ ہر دل عزیز بہو بن سکتی ہے اور نیک اور شفیق ساس ہوسکتی ہے، وہ اپنے بچوں کی معلم اوّل ہوسکتی ہے، وہ خاندانی نظام کو مربوط رکھ سکتی ہے، معاشی تنگی کو خوش حالی سے بدل کر معاشی نظام مضبوط کرسکتی ہے، وہ شوہر کے مرجھائے اور افسردہ چہرے پر گل افشانی کرسکتی ہے، میخانے کو مسجد اور بت خانے کو عبادت خانہ بنا سکتی ہے، اولاد کو جذبۂ جہاد سے سرشار کرسکتی ہے؛ الغرض دینی تعلیم یافتہ عورت وہ سب کچھ بہت آسانی سے کرسکتی ہے جو اسلام چاہتا ہے، اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوجائے تو منفی نتیجہ کیسا خوف ناک ہوگا، اندازہ کرنا مشکل نہیں اور دینی تعلیم سے بے انتہا غفلت عورت کو شیطان بنا دیتا ہے۔

لائق توجہ پہلو

ضرورت اور وقت دونوں اس امر کے متقاضی ہیں کہ تعلیم نسواں کے حوالے سے مزید بیداری پیدا کی جائے اور اس کی جانب سنجیدگی سے توجہ دی جائے؛ لیکن اس سلسلے میں یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ عورتوں اور لڑکیوں کو تعلیم کے لیے محفوظ مقامات اور تعلیم گاہیں ہوں، عورتوں کی تعلیم کے لیے سب سے محفوظ اور ہر طرح کی برائیوں سے پاک جگہ، خود اس کا گھر ہے، گھر میں ایسا انتظام اگر مشکل ہو تو غیر اقامتی اسکول اور مدرسے ہیں، جہاں صرف لڑکیوں کو ہی تعلیم دی جاتی ہو اور تعلیم دینے والا تدریسی عملہ عورتوں پر ہی مشتمل ہو، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی معروف ہستی، اور متبحر عالم دین حضرت مولانا ومفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کی کتاب ہمارا تعلیمی نظام سے ایک اقتباس نقل کر کے مضمون ختم کیا جائے، لکھتے ہیں:

> ”تعلیم نسواں ایک مستقل چیز ہے اور مخلوط تعلیم ایک جداگانہ چیز ہے، ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط وہی بے دین اور بے حمیت یورپ زدہ لوگ کرتے ہیں جو فروغ تعلیم نسواں کی آڑ میں مخلوط تعلیم کو فروغ دینا اور عام کرنا چاہتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کی حدود میں رہ کر تعلیمِ نسواں کو زیادہ سے زیادہ عام کرنا چاہیے؛ تاکہ نئی نسل اعلیٰ اخلاق وکردار کی مالک بن سکے؛ مگر معاشی اعانت کے لیے عورتوں کی تعلیم کو ذریعہ بنانا غیرفطری بھی ہے اور غیراسلامی بھی؛ اس لیے کہ قرآن حکیم بیوی بچوں کی کفالت کا ذمہ دار مرد کو قرار دیتا ہے اور اسلامی تعلیمات کی رو سے عورت کی ذمہ داری شرعی فرائض ادا کرنے کے بعد تمام جائز اور مباح امور میں شوہر کی اطاعت کرنا، اس کی حوائج اور سامانِ راحت وآسائش کو مہیا کرنا ہے؛ تاکہ بچے اور شوہر تفریح کے لیے گھر سے باہر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں۔

آگے لکھتے ہیں:

لڑکیوں کا نصابِ تعلیم، نظامِ تعلیم اور معیارِ تعلیم مذکورہ بالا مقاصد کے تحت مرتب ومدون اور مردوں سے بالکل الگ اور جداگانہ ہونا چاہیے.... اگر تعلیم نسواں سے اس کے صحیح فوائد حاصل کرنے ہیں تو مخلوط تعلیم کو ختم کرنا قطعی لازم ہے؛ اس لیے کہ مخلوط تعلیم تو اسلامی روح کے بھی قطعی منافی ہے اور ذہنی وفکری آسودگی اور اخلاقی پاکیزگی کے لیے بھی سمِ قاتل ہے، اس کی اجازت کسی صورت میں بھی نہیں دی جاسکتی ہے۔'' (ہمارا تعلیمی نظام، ص:۳۲)

اللہ ہمیں دینی تعلیم کے حصول کی توفیق دے اور ہمیں یہ سمجھنے کی بھی توفیق دے کہ ہماری اخروی ودنیوی؛ بلکہ اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور تعلیمی فلاح وبہبود کا راز اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں ہی مضمر ہے، اس کے علاوہ سب نفس کا دھوکہ ہے، اس کا فائدہ عارضی اور وقتی ہے؛ ہم اسے سمجھیں، شریعت یہی چاہتی ہے، وقت یہی چاہتا ہے، سب سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ یہی چاہتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

ایک مردِ درویش کی رحلت

حبیب الرحمٰن اعظمی (مدیر)

علمی ودینی حلقوں کے لیے یہ خبر باعثِ رنج وغم ہوگی کہ جامعہ بدرالعلوم گڑھی دولت کاندھلہ کے مہتمم حضرت مولانا محمد کامل کاندھلوی خلیفۂ اجل حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنی قدس سرہ ۱۵؍ربیع الاوّل ۱۴۳۶ھ مطابق ۷؍جنوری ۲۰۱۵ء ،۸۲ سال کی عمر میں انتقال کرگئے، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، اللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَاجْعَلْ مِنْ عِبَادِكَ الْمُقَرَّبِیْنَ ! (آمین)

مولانا مرحوم ایک نیک دل، نیک ذات، نیک صفات بافیض عالمِ دین تھے، تواضع وانکساری ان کا طرۂ امتیاز تھا، نرم خوئی ونرم روی ان کی عادتِ ثانیہ تھی، حلم وبردباری ان کا مزاج وطبیعت تھی، ان کی کتابِ زندگی میں نمود ونمائش اور خواہشِ شہرت وناموری کا باب گویا تھا ہی نہیں، ان کے پیشِ نظر تو محض رضائے الٰہی کے لیے اللہ کے بندوں کی علمی و دینی ہدایت اور رہنمائی تھی، ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر اسی میں انھوں نے اپنی پوری حیات صرف کردی، پھر اس احتیاط کے ساتھ کہ کسی دل کو ان کے کسی عمل سے رنج اور ٹھیس نہ پہنچے۔

قدرتِ الٰہی جب کسی بندہ سے کوئی خدمت لینا چاہتی ہے تو اسی انداز سے اس کی نشو ونما اور تربیت کی تدبیر بھی کرتی ہے؛ چنانچہ انھیں ابتدائی تعلیمی وتربیتی زندگی میں حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ جیسا باکمال عالم باعمل مربی میسر آگیا اور برسوں ان کی خدمت میں رہ کر تعلیم کے ساتھ دینی وفکری تربیت بھی حاصل کی؛ چونکہ معمارِ اولین نے ان کی زندگی کی تعمیر کی خشتِ اول مستقیم اور سیدھی رکھی تھی؛ اس لیے اس پر جو عمارت بلند ہوئی وہ استحکام واستقامت کا

نمونہ ثابت ہوئی، اس کے بعد حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب اور علمائے کاندھلہ کے علوم وہدایت کے باصفا امین ووارث حضرت مولانا افتخارالحسن معروف بہ بڑے حضرت جی دامت فیوضہم سے درسِ نظامی کی متوسطات کی تحصیل وتکمیل کی، ان دونوں بزرگ اساتذہ کی صاف وستھری علمی ودینی تربیت کا اثر مولانا مرحوم کی سیرت وکردار میں آخر تک نمایاں رہا، آگے کی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند پہنچے اور پانچ سال یہاں زیرِتعلیم رہ کر ۱۹۵۲ء میں شیخ العرب والعجم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ جیسے محدثِ کبیر اور شیخِ کامل سے صحیح بخاری وغیرہ پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کی، تعلیمی مراحل طے کرلینے کے بعد حضرت شیخ الاسلامؒ کے دستِ حق پرست پر بیعتِ طریقت سے فیض یاب ہوئے اور حضرت کی ہدایت ورہنمائی میں ذکر واذکار اور تزکیۂ نفس وتطہیر قلب میں مشغول ہوگئے۔ دراصل مولانا مرحوم کا یہی طبعی ذوق بھی تھا جس کو حضرت شیخ الاسلامؒ کی صحبت وتربیت نے مجلّی اور روشن کردیا۔

چونکہ اکابر واسلاف کا عمومی طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ارشاد وطریقت کے ساتھ علمی وابستگی بھی رکھتے رہے ہیں؛ اس لیے مولانا مرحوم بھی اپنے علاقہ کے ایک مدرسہ سے وابستہ ہوگئے، وہیں سے گڑھی دولت کے اصحابِ خیر وصلاح باصرار مولانا کو اپنے مدرسہ بدرالعلوم میں لے آئے اور تدریس کے ساتھ مدرسہ کا اہتمام بھی انھیں سپرد کردیا، اس وقت سے تادمِ واپسیں مولانا مرحوم اسی کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہے اور اپنے حسنِ انتظام وخلوصِ نیت سے اسے ایک مدرسہ سے جامعہ بنادیا، جہاں اس وقت دورۂ حدیث تک کی مکمل تعلیم ہورہی ہے۔

مولانا محمد کامل رحمہ اللہ نام ہی کے نہیں؛ بلکہ صحیح معنوں میں ایک مردِ کامل تھے، فقر ودرویشی اگرچہ ان کی شرشت میں شامل تھی پھر بھی وہ علوم وفنون میں بھی قابلِ قدر دستگاہ رکھتے تھے، اور چھوٹی بڑی سب کتابوں کا درس دیتے تھے۔ اسی کے ساتھ ایک اچھے منتظم بھی تھے اور سب سے بڑھ کر ایک کامیاب مرشد ومربی تھے، ان کے دامنِ تربیت سے ہزاروں لوگ منسلک تھے، وہ مدرسہ کی انتظامی مشغولیتوں کے ساتھ ان کی اصلاح وتربیت پر بھی نظر رکھتے تھے۔

مولانا مرحوم ایک خاموش طبع آدمی تھے، اپنی علمی ودینی وتربیتی خدمات بھی خاموشی کے ساتھ انجام دینے کے عادی تھے، اس کے باوجود اللہ رب العزت نے بڑی مقبولیت سے نوازا

تھا، جس کا کچھ اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ موسم کی سخت ناسازگاری اور کڑاکے کی سردی کے باوجود ان کی نمازِ جنازہ میں پچاس ہزار سے زیادہ کا مجمع تھا۔

حضرت مولانا مرحوم اب اس دنیا میں نہیں ہیں؛ اس لیے مجھے اب اپنے اس تاثر کے اظہار میں کوئی تردد نہیں ہے کہ ان سے جب بھی ملاقات ہوئی تو ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی دل میں یہ خیال آجاتا تھا کہ مولانا اللہ تعالیٰ کے ان مخصوص بندوں میں سے ہیں جن کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ "إذا رؤا ذکر اللّٰہ"۔

دعا ہے کہ خدائے رحیم وکریم ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اپنے مرحوم ومغفور بندوں کی اعلیٰ علیین میں رفاقت عطا فرمائے، نیز پس ماندگان کو صبرِ جمیل اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے، آمین!

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈھنے نکلو گے؛ مگر پا نہ سکو گے

❁ ❁ ❁